الرسالہ

ISSN 0970-180X

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خان
صدر اسلامی مرکز

تخریب کاری دو دھاری تلوار ہے
پہلے وہ دشمن کو کاٹتی ہے
اور اس کے بعد خود اپنے آپ کو

شمارہ ۱۶۰

مارچ ۱۹۹۰

تذکیر القرآن

جلد اوّل : سورۃ فاتحہ۔ سورۃ بنی اسرائیل
جلد دوم : سورۃ الکہف۔ سورۃ الناس

قرآن کی بے شمار تفسیریں ہر زبان میں لکھی گئی ہیں۔ مگر تذکیر القرآن اپنی نوعیت کی پہلی تفسیر ہے۔ تذکیر القرآن میں قرآن کے اساسی مضمون اور اس کے بنیادی مقصد کو مرکز توجہ بنایا گیا ہے۔ جزئی مسائل اور معلوماتی تفصیلات کو چھوڑتے ہوئے اس میں قرآن کے اصل پیغام کو کھولا گیا ہے اور عصری اسلوب میں اس کے دعوتی اور تذکیری پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ تذکیر القرآن عوام و خواص دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہے۔ وہ طالبین قرآن کے لیے فہم قرآن کی کنجی ہے۔

ہدیہ جلد اول ۱۲۵ روپیہ
جلد دوم ۱۲۵ روپیہ

مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو، انگریزی میں شائع ہونے والا

الرسالہ

اسلامی مرکز کا ترجمان

شمارہ ۱۶۰ مارچ ۱۹۹۰

فہرست

ماہنامہ الرسالہ، سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳ فون: 611128 697333

قرآن کا کرشمہ

اسلام سے پہلے عرب میں تعلیم بہت کم تھی۔ ۸ھ میں جو اتنا (بحرین، الحسار) جیسے بڑے مقام پر نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک تبلیغی خط بھیجا۔ راوی کہتے ہیں کہ سارے علاقے اور قبیلہ میں ایک شخص بھی نہ تھا جو خط کو پڑھ سکے۔ لوگ تلاش کرتے رہے یہاں تک کہ ایک نوجوان ملا جس نے خط کو پڑھ کر سنایا۔ تقریباً اسی زمانہ کا واقعہ ہے، النمر بن تولَب مسلمان ہوئے۔ وہ ایک بڑے قبیلہ کے سردار تھے اور اتنے بڑے شاعر تھے کہ ان کے اشعار کا ایک دیوان تیار ہوا ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے انھیں ان کے قبیلہ عکل (یمن) کا سردار مقرر کرکے ایک تحریری پروانہ عطا کیا۔ مگر وہ اس کو پڑھ نہیں سکتے تھے۔ بازار میں آکر پوچھنے لگے "کیا آپ لوگوں میں کسی کو پڑھنا آتا ہے جو یہ خط پڑھ مجھ کو سنا دے"

کہا جاتا ہے کہ بعثتِ نبوی کے وقت شہر مکہ میں مشکل سے چند درجن آدمی ایسے مل سکتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے ہوں۔ مدینہ میں اس سے بھی کم عرب یہ فن جانتے تھے۔ لیکن دوسری صدی ہجری ہی میں عربی زبان علمی نقطۂ نظر سے دنیا کی متمول ترین زبان بن گئی۔ عربوں میں لسانی ترقی کا زمانہ اتنا مختصر ہے کہ دنیا کی پرانی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

عربوں کی تیز رفتار علمی اور لسانی ترقی کا یہ واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ یہ حیرت انگیز واقعہ براہ راست قرآن کا کرشمہ تھا۔ قرآن ایک کتاب دعوت ہے۔ جو شخص قرآن سے متاثر ہوتا ہے اور اس پر ایمان لاکر اسے پڑھتا ہے، اس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ قرآن نے اس کو داعی بنا دیا ہے۔ اس کا دل ودماغ داعی کا دل ودماغ بن جاتا ہے۔ اس کے اندر یہ سیلاب امنڈ پڑتا ہے کہ اس نے جس ابدی صداقت کو خدا کی کتاب کے ذریعہ پایا ہے، اس کو وہ تمام انسانوں تک پہنچا دے۔

یہ دعوتی جذبہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ زبانوں کو سیکھے۔ وہ ہر طرح کی واقفیت حاصل کرے۔ وہ اپنے آپ کو علمی اعتبار سے مسلح کرے۔ پہلے اگر وہ بے زبان تھا تو اب وہ بازبان بن جاتا ہے۔ پہلے اگر وہ بے علم تھا تو اب وہ باعلم ہو جاتا ہے۔ دعوت اپنی عین فطرت کے اعتبار سے آدمی کو صاحبِ علم اور صاحبِ شعور بنا دیتی ہے۔ دعوت کے ساتھ بے علمی اور بے شعوری کا جمع ہونا ممکن نہیں۔

کامیابی کی قیمت

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (البقرہ ۲۴۹) حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جان لو کہ فتح ہمیشہ صبر کے ساتھ آتی ہے (اعلم ان النصر مع الصبر)

صبر کامیابی کی قیمت ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اس کے خلاف باتوں کو چھوڑنا برداشت کیا جائے۔ امریکی سنگر ایگورگورن (Igron Gorin) نے اپنے حالات کے ذیل میں بتایا ہے کہ پہلے وہ بہت زیادہ پائپ پیا کرتا تھا۔ اس کے استاد نے کہا کہ ایگور، تم کو اپنے بارہ میں طے کرنا ہوگا کہ تم ایک عظیم سنگر بننا چاہتے ہو یا عظیم پائپ اسموکر۔ تم بیک وقت دونوں نہیں بن سکتے۔

ایگور نے پائپ پینا چھوڑ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ایک عظیم سنگر بن گیا۔ پانے کی خاطر چھوڑنے کے اسی فعل کا نام صبر ہے۔ اس صابرانہ اصول کو امریکہ کے ایک ماہر نفسیات نے ان لفظوں میں بیان کیا ــــــ ہر انعام کی ایک قیمت ہے۔ اس دنیا میں انعام ہاں ہے، اور اس کی قیمت نہیں:

Every prize has its price. The prize is the yes; the price is the no (p. 68).

یہ قول نہایت بامعنی ہے۔ اگر آپ ایک منظم اور بااصول آدمی بننا چاہتے ہیں تو آپ کو غیر ضروری عادتیں چھوڑنی پڑیں گی۔ اگر آپ ایک صحت مند انسان بننا چاہتے ہیں تو آپ کو وہ چیزیں چھوڑنی پڑیں گی جو صحت کو غارت کرنے والی ہیں۔ آدمی پہلے "نہیں" کو برداشت کرتا ہے۔ اس کے بعد ہی اس کو "ہاں" کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی گروہ یہ چاہتا ہے کہ وہ تعلیم اور روزگار اور صنعت وتجارت میں ترقی کرے، تو اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی طے کرنا ہوگا کہ وہ لڑائی جھگڑے سے بچے گا۔ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ دوسروں کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت نہیں آنے دے گا۔ وہ ایسی ہر سرگرمی سے اپنے آپ کو بچائے گا جو دوسرے سماجی گروہوں سے رقابت اور دشمنی کا تعلق پیدا کرنے والا ہو۔ کیوں کہ ترقی پُرامن حالات میں حاصل کی جا سکتی ہے، نزاع اور فساد کے حالات میں ترقی کا سفر ممکن نہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے ٹوٹی ہوئی ریلوے لائن پر ٹرین کا سفر ممکن نہیں ہوتا۔

پہلا اسکول

علم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر دوسری مصلحت پر اس کو فوقیت حاصل ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمان تعلیم کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے ہوگئے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موجودہ زمانہ میں جو تعلیمی ادارے قائم ہوئے، ان کے اساتذہ زیادہ تر غیر مسلم تھے۔ مسلمانوں کے رہنماؤں نے کہا کہ یہ غیر مسلم استاد ہمارے بچوں کو خراب کر دیں گے، اس لیے ان اداروں میں مسلمانوں کو داخل کرنا درست نہیں۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے ہو گئے۔

یہ مصلحت درست نہ تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اسلام کی تاریخ میں جو سب سے پہلا اسکول کھولا گیا، اس کے تمام استاد غیر مسلم تھے۔ یہ اسکول مدینہ میں مشرک قیدیوں کے ذریعہ کھولا گیا۔ بعض لوگ صفہ کو پہلا اسلامی مدرسہ کہتے ہیں۔ مگر صفہ تربیت گاہ تھا نہ کہ تعلیم گاہ۔ اسلام کی پہلی تعلیم گاہ یقیناً وہ ہے جو غزوۂ بدر کے قیدیوں کے ذریعہ مدینہ میں قائم کی گئی اور اس کے ٹیچر سب کے سب مشرک اور غیر مسلم تھے۔

حتی کہ اس تعلیمی نظام کی بنا پر مدینہ میں مسائل بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً مسند احمد بن حنبل کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر کیا کہ وہ انصار کے لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ اس کے بعد ایک روز ایک لڑکا روتا ہوا اپنی ماں کے پاس آیا۔ ماں نے پوچھا تمہارا حال کیا ہے۔ اس نے کہا کہ میرے معلم نے مجھ کو مارا ہے۔

(جعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فداءھم أن یعلموا اولاد الانصار الکتابۃ۔ فجاء غلام یوماً یبکی الی امہ فقالت ماشانک۔ فقال ضربنی معلمی) (سیرۃ ابن کثیر، جلد ثانی، صفحہ ۵۱۲)

یہ قیدی سب کے سب اسلام کے دشمن تھے۔ ان کو چھوڑنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ اسلام کے خلاف مسئلہ بنیں گے۔ اس کے باوجود انھیں تعلیم کی قیمت پر چھوڑ دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ تعلیم کی اہمیت اسلام میں اتنی زیادہ ہے کہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے اسے حاصل کرنا چاہیے۔

سبب اپنے اندر

مارٹن لوتھر کنگ (Martin Luther King, Jr.) کا قول ہے کہ کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک وہ جھکی ہوئی نہ ہو:

A man can't ride your back unless it's bent.

یہ قول تمثیل کی زبان میں زندگی کی ایک حقیقت بیان کر رہا ہے۔ آپ بالکل سیدھے کھڑے ہوئے ہوں تو کسی شخص کو یہ موقع نہیں ملے گا کہ وہ کود کر آپ کی پیٹھ پر بیٹھ جائے۔ کسی شخص کو یہ موقع صرف اس وقت ملتا ہے جب کہ آپ کی پیٹھ جھک جائے۔ جھکی ہوئی پیٹھ پر سواری ممکن ہے، نہ کہ سیدھی تنی ہوئی پیٹھ پر۔

یہی معاملہ زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں مغلوبیت دراصل اپنی کمزوری کی قیمت ہے۔ کوئی شخص آپ پر قابو صرف اس وقت پاتا ہے جب کہ آپ کمزور ہو کر اس کو اپنے اوپر قابو پانے کا موقع دیدیں۔ اس لیے عقل اور حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص آپ پر غالب ہوتا ہوا نظر آئے تو سب سے پہلے اپنے آپ میں غور کر کے اپنی اس کمزوری کو دور کیجئے جس نے دوسرے شخص کو یہ موقع دیا کہ وہ اس کو استعمال کر کے آپ کے اوپر غلبہ حاصل کرلے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اُحد کی جو لڑائی ہوئی، اس میں مسلمان ابتداءً جیت رہے تھے۔ مگر ان کی جیت بعد کو ہار میں تبدیل ہوگئی۔ اس کی وجہ خود مسلمانوں کے ایک گروہ کی غلطی تھی۔ چنانچہ قرآن میں جب اس واقعہ پر تبصرہ نازل ہوا تو فریق ثانی کے ظلم و سرکشی پر کچھ نہیں کہا گیا۔ قرآن کے تبصرہ (آل عمران ۱۵۲) میں ساری تنبیہ صرف مسلمانوں کو کی گئی۔ تاکہ مسلمانوں کے اندر اپنی کوتاہی کا شدید احساس پیدا ہو۔ وہ اپنی کوتاہی کی اصلاح کے ذریعہ اس بات کو ناممکن بنادیں کہ آئندہ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کر کے ان کے اوپر کامیابی کی امید کر سکے۔

آدمی جب بھی کسی دوسرے کے مقابلہ میں ہارتا ہے تو وہ اپنی ذاتی کمی کی بنا پر ہارتا ہے۔ اپنی ذاتی کمی کو جان کر اسے دور کیجئے، اور اس کے بعد آپ کو نہ کسی کے خلاف فریاد کی ضرورت ہوگی اور نہ احتجاج کی۔

سادہ حل

ایک صاحب نے اپنا واقعہ لکھا ہے۔ کسی قدر لفظی تصرف کے ساتھ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک صحرائی علاقہ میں گئے۔ وہ تانگہ پر سفر کر رہے تھے۔ اتنے میں آندھی کے آثار ظاہر ہوئے۔ تانگہ والے نے اپنا تانگہ روک دیا۔ اس نے بتایا کہ اس علاقہ میں بڑی ہولناک قسم کی آندھی آتی ہے۔ وہ اتنی تیز ہوتی ہے کہ بڑی بڑی چیزوں کو اڑالے جاتی ہے۔ اور آثار بتا رہے ہیں کہ اس وقت اسی قسم کی آندھی آرہی ہے۔ اس لیے آپ لوگ تانگہ سے اتر کر اپنے بچاؤ کی تدبیر کریں۔

آندھی قریب آگئی تو ہم ایک درخت کی طرف بڑھے کہ اس کی آڑ میں پناہ لے سکیں۔ تانگہ والے نے ہمیں درخت کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ چیخ پڑا۔ اس نے کہا کہ درخت کے نیچے ہرگز نہ جائیے۔ اس آندھی میں بڑے بڑے درخت گر جاتے ہیں۔ اس لیے اس موقع پر درخت کی پناہ لینا بہت خطرناک ہے۔ اس نے کہا کہ اس آندھی کے مقابلہ میں بچاؤ کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ آپ لوگ کھلی زمین پر اوندھے ہو کر لیٹ جائیں۔ ہم نے تانگہ والے کے کہنے پر عمل کیا اور زمین پر منھ نیچے کر کے لیٹ گئے۔ آندھی آئی اور بہت زور کے ساتھ آئی۔ وہ بہت سے درختوں اور ٹیلوں تک کو اڑالے گئی۔ لیکن یہ سارا طوفان ہمارے اوپر سے گزرتا رہا۔ زمین کی سطح پر ہم محفوظ پڑے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب آندھی کا زور ختم ہوا تو ہم اٹھ گئے۔ ہم نے محسوس کیا کہ تانگہ والے کی بات بالکل درست تھی۔ (ذکریٰ، نومبر ۱۹۸۹)

آندھیاں اٹھتی ہیں تو ان کا زور ہمیشہ اوپر اوپر رہتا ہے۔ زمین کی نیچے کی سطح اس کی براہ راست زد سے محفوظ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آندھی میں کھڑے ہوئے درخت تو اکھڑ جاتے ہیں، مگر زمین پر پھیلی ہوئی گھاس بدستور قائم رہتی ہے۔ ایسی حالت میں آندھی سے بچاؤ کی سب سے زیادہ کامیاب تدبیر یہ ہے کہ اپنے آپ کو وقتی طور پر نیچا کر لیا جائے۔

یہ قدرت کا سبق ہے جو بتاتا ہے کہ زندگی کے طوفانوں سے بچنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کا سادہ سا طریقہ یہ ہے کہ جب آندھی اٹھے تو وقتی طور پر اپنا جھنڈا نیچا کر لو —— کوئی شخص اشتعال انگیز بات کہے تو تم اس کی طرف سے اپنے کان بند کر لو۔ کوئی تمہاری دیوار پر کیچڑ پھینک دے تو اس کے اوپر پانی بہا کر اسے صاف کر دو۔ کوئی تمہارے خلاف نعرہ بازی کرے تو تم اس کے لیے دعا کرنے میں مصروف ہو جاؤ۔

غلط فہمی

ٹائمس آئی فاؤنڈیشن (Times Eye Research Foundation) کی طرف سے نئی دہلی میں ایک سیمنار ہوا۔ اس کی کارروائیاں ۶ ستمبر ۱۹۸۹ کو انڈیا انٹرنیشنل سنٹر میں انجام پائیں۔ اس سیمنار کا موضوع آنکھ کا عطیہ اور مذہب (Eye Donation and Religion) تھا۔ منتظمین کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی وہاں ایک پیپر پیش کیا۔ اس کا موضوع تھا ـــــــــــ آنکھ کا عطیہ اور اسلام:

Eye Donation and Islam

سیمنار کی کارروائی کے دوران ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ پروگرام منیجر مسٹر اے پی آتری نے ایک سوال کے جواب میں اپنا ایک ذاتی قصہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ دن پہلے میرے ایک پوتے کا انتقال ہوگیا۔ اس کی عمر تقریباً سات سال تھی۔ جب لڑکے کی آخری رسوم ادا کرنے کا وقت آیا تو مسٹر آتری کے دوست اور رشتہ دار ان کے گھر پر جمع ہوئے۔ ان کے ایک دوست نے لڑکے کے جسم کو دیکھ کر کہا کہ آتری جی، آپ لوگوں سے کہتے ہیں کہ مرنے کے بعد اپنی آنکھیں دان میں دو۔ مگر آپ نے خود اپنے پوتے کی آنکھ دان نہیں کی۔ اس کی آنکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ویسی کی ویسی ہی ہیں۔

یہ اعتراض محض غلط فہمی پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ لڑکے کی موت کے بعد مسٹر آتری نے اسپتال کو ٹیلی فون کیا۔ وہاں سے ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر مع سازوسامان آیا۔ اس نے نہایت صفائی کے ساتھ اس کی آنکھیں نکالیں اور پھر حسب قاعدہ دونوں آنکھوں میں پلاسٹک کی مصنوعی آنکھ لگادی۔ اس واقعہ سے لاعلم ہونے کی بنا پر مسٹر آتری کے دوست کو غلط فہمی ہوئی۔ بچہ کے چہرہ پر انھوں نے جس آنکھ کو دیکھا وہ مصنوعی آنکھ تھی، اس کی اصل آنکھ تو اس سے پہلے عطیہ میں دی جاچکی تھی۔

اکثر بدگمانی محض غلط فہمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی کے بارہ میں غلط رائے قائم نہ کرے۔ اور اگر اس کو رائے قائم کرنا ہے تو پہلے تحقیق کرے۔ تحقیق سے پہلے کسی کے بارہ میں بری رائے قائم کرنا جائز نہیں۔

معیار کو بلند کرنا

قدیم عرب میں برابر کی اخلاقیات کا رواج تھا۔ ان کی زندگی کا اصول یہ تھا کہ جو شخص جیسا کرے، اس کے ساتھ ویسا ہی کیا جائے۔ یعنی اچھا سلوک کرنے والے کے ساتھ اچھا سلوک اور برا سلوک کرنے والے کے ساتھ برا سلوک۔ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف قبیلہ کے بارہ میں کہتا ہے کہ زیادتی کی کوئی قسم ہم نے باقی نہیں چھوڑی۔ انھوں نے ہمارے ساتھ جیسا کیا تھا، ویسا ہی ہم نے ان کو بدلہ دیا:

فلم یبق من العدوان دناهم کما دانوا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو آپ نے ان کے اس تصور اخلاق کو بدلا۔ مساویانہ اخلاق کے بجائے آپ نے ان کو بلند اخلاق کی تعلیم دی۔ آپ نے فرمایا کہ اَحسِنْ الیٰ من اساء الیک (جو شخص تمہارے ساتھ برا سلوک کرے، اس کے ساتھ تم اچھا سلوک کرو) ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

لا تکونوا اِمّعَةً تقولون ان احسن الناس احسنّا وان ظلموا ظلمنا۔ ولکن وطّنوا انفسکم، ان احسن الناس اَن تُحسنوا وان اساؤوا فلا تظلموا۔
(مشکاۃ المصابیح، الجزء الثالث، صفحہ ۱۴۱۸)

تم لوگ اِمّعہ نہ ہو کہ یہ کہنے لگو، اگر لوگ ہمارے ساتھ اچھا کریں تو ہم بھی ان کے ساتھ اچھا کریں گے۔ اور اگر وہ زیادتی کریں تو ہم بھی زیادتی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرو کہ لوگ تمہارے ساتھ اچھا کریں تو تم ان کے ساتھ اچھا کرو گے اور اگر لوگ تمہارے ساتھ برا کریں تب بھی تم ان کے ساتھ زیادتی نہیں کرو گے۔

آپ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ لوگوں کے شعور کو بلند کیا جائے۔ ان کے اخلاق کو اونچا کیا جائے۔ ان کی حالت کو ہر اعتبار سے اوپر اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

انسان کے انسانی معیار کو بلند کرنا، فکری، علمی، اخلاقی حیثیت سے اس کو اوپر اٹھانا، اہم ترین کام ہے۔ اسی میں فرد کی بھلائی ہے اور اسی میں پورے معاشرہ کی بھلائی بھی۔ یہ عین سنت رسول ہے اور اس کو زندہ کرنا سنت رسول کو زندہ کرنا ہے۔

طلبہ کے نام

ایک عربی درس گاہ کے طلبہ کو ایک بار مجھے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ میں نے کہا کہ صحیح ابن حبان میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے ایک روایت آئی ہے۔ اس میں مسلم عاقل کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس کو اپنے زمانہ سے باخبر ہونا چاہیے (ان یکون بصیراً بزمانہ)

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے۔ اس کے مطابق آپ کو چاہیے کہ آپ صرف واقفِ دین نہ بنیں بلکہ اسی کے ساتھ واقفِ زمانہ بھی بنیں۔ اس کے بعد ہی آپ موجودہ زمانہ میں دین کی صحیح خدمت کر سکتے ہیں۔

واقفِ زمانہ بننے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ مسلمانوں کے خلاف ہونے والے "ظلم اور سازش" کو جاننے کے ماہر بن جائیں۔ یہ میرے نزدیک سطحیت ہے نہ کہ علم۔ یہ ظواہر کو جاننا اور حقائق سے بے خبر رہنا ہے۔ اور علم بلا شبہ یہ ہے کہ آدمی اصل حقیقت کو جانے، نہ یہ کہ اس کی نگاہ ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جائے۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ دوسری قومیں مسلمانوں کے خلاف سازش اور ظلم میں مصروف ہیں۔ تب بھی اصل جاننے کی بات یہ ہے کہ وہ کیا اسباب ہیں جنھوں نے ان قوموں کو یہ حیثیت دیدی ہے کہ وہ ہمارے خلاف کامیاب سازشیں کر سکیں۔ وہ ہمارے خلاف اپنے ظالمانہ منصوبوں کی کامیاب تعمیل کریں اور ہمارے تمام اعاظم و اکابر اس کو روکنے میں مکمل طور پر عاجز ثابت ہوں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اصل کمی یہ ہے کہ وہ عصر حاضر سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہ گزرے ہوئے ماضی کے واقعات کو جانتے ہیں۔ مگر آج کے واقعات کی انھیں مطلق خبر نہیں۔ ان میں سے کوئی شخص اگر کچھ جانتا ہے تو وہ بھی ظاہری نتائج کو جانتا ہے نہ کہ نتائج کے اصل اسباب کو۔

مدارس دینیہ کے طلبہ اگر صرف "حیوان کاسب" بن کر نہیں رہنا چاہتے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو اسلام اور ملتِ اسلام کے احیاء میں مفید طور پر لگائیں تو ان پر لازم ہے کہ وہ عصرِ حاضر کو اس کی گہرائیوں کے ساتھ جانیں، وہ موجودہ زمانہ کی ان تبدیلیوں سے واقفیت حاصل کریں جنھوں نے ہمارے مروجہ طریقوں کو عملی اعتبار سے بالکل غیر موثر بنا کر رکھ دیا ہے۔

حسرت کا دن

قرآن میں قیامت کے دن کو ندامت اور حسرت کا دن (مریم ۳۹) کہا گیا ہے۔ قیامت کے دن جب تمام حقیقتیں کھلیں گی تو آدمی اچانک محسوس کرے گا کہ دنیا میں کیسے کیسے قیمتی مواقع تھے جب کہ وہ خدا پرستی کا ثبوت دے کر آخرت میں اس کا انعام پا سکتا تھا۔ مگر اس وقت اس نے یہ مواقع کھودیے اور اب یہ مواقع کبھی اس کے لیے آنے والے نہیں۔ مواقع کو کھونے کا یہ احساس بلاشبہ سب سے بڑی نفسیاتی سزا ہوگی جو ابدی طور پر آدمی کو تڑپاتی رہے گی۔ دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

وانه لتذكرة للمتقين۔ وانا لنعلم ان منكم مكذبين۔ وانه لحسرة على الكافرين (الحاقۃ ۴۸ - ۵۰)

اور بلاشبہ یہ یاددہانی ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ منکروں کے لیے پچھتاوا ہے۔

دنیا میں بار بار آدمی کے سامنے وہ مواقع آتے ہیں جب کہ وہ ایک عمل کر کے آخرت کا انعام حاصل کر سکے۔ مگر آدمی ظلم اور علو (النمل ۱۴) کی بنا پر مطلوبہ عمل نہیں کرتا۔ ایسے لوگ جب دنیا سے نکل کر آخرت میں پہونچیں گے تو اچانک وہ محسوس کریں گے کہ یہاں ان کے لیے حسرت اور پشیمانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب ایک ایک کر کے انھیں وہ گزرے ہوئے لمحات یاد آئیں گے جب کہ ان کے سامنے آخرت کے لیے عمل کرنے کا ایک موقع آیا، مگر انھوں نے اس موقع کو بے دردانہ طور پر کھودیا۔

اس وقت آدمی کہے گا کہ آہ، میرے سامنے امر حق ظاہر ہوا جس کا ساتھ دے کر میں حق کا اعتراف کرنے والا بن سکتا تھا۔ مجھے موقع ملا کہ میں حق کو اس کے حقدار کے حوالہ کردوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں حق کی گواہی دینے والا بنوں۔ مجھے یہ موقع ملا کہ میں درست بات کہوں، خواہ وہ میرے موافق ہو یا میرے خلاف۔ مجھے موقع ملا کہ میں ان لوگوں میں بنوں جو خدا کے خوف سے اپنی زبان بند کر لیتے ہیں، مگر ان مواقع کو میں نے کھودیا۔ میں اپنے آپ کو خدا کے مطلوب بندوں کی فہرست میں درج نہ کرا سکا۔ میں نے دنیا میں نیکی کے مواقع کو کھویا تھا، اس لیے آخرت میں انعام کے مواقع میں بھی اب میرا کوئی حصہ نہیں۔

اللہ کی مدد

پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور اس کے بعد مسلمانوں کو جو غیر معمولی قسم کی عالمی فتوحات حاصل ہوئیں، اس کی توجیہہ پر تاریخ دانوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کا مقالہ نگار اس سلسلہ میں لکھتا ہے :

At least three aspects of the contemporary situation of Byzantium and Persia account for the phenomenal ease with which the Arabs overcame their enemies: first, both empires exhausted by wars, had demobilized before 632 (vol 3, p. 557).

اس زمانہ کی بازنطینی اور ایرانی شہنشاہیت کے کم از کم تین پہلو ہیں جو اس بات کی تشریح کرتے ہیں کہ ان کے اوپر عربوں کو اتنی آسانی سے اتنی نمایاں کامیابی کیسے حاصل ہوئی۔ ان میں سے پہلا سبب یہ ہے کہ دونوں شہنشاہیتیں آپس کی جنگ کے نتیجہ میں اتنا برباد ہوئی تھیں کہ وہ ۶۳۲ء سے پہلے ہی فوجی اعتبار سے ختم ہو چکی تھیں۔

یہ بات تاریخی اعتبار سے صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ کیوں کہ یہ حقیقت ہے کہ دونوں شہنشاہیتوں نے غیر معمولی فوجی طاقت سے مسلمانوں کا مقابلہ کیا۔ تاہم اس سے قطع نظر، مسلمانوں کے ساتھ مقابلہ پیش آنے کے عین پہلے دونوں شہنشاہیتوں میں طویل خونی جنگ کا پیش آنا، اسلام کے حق میں براہ راست خدائی مدد تھا۔ موجودہ دنیا میں خدا کی مدد اسباب کے پردہ میں آتی ہے۔ اور روم و ایران کی باہمی جنگ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دشمنوں کو اتنا کمزور کر دیا کہ وہ اسلام کے لیے کوئی طاقت ور خطرہ نہ بن سکیں۔

آج بھی خدا کی یہ مدد ظاہر ہو سکتی ہے بشرطیکہ اہل اسلام اپنے عمل سے اس کا وہی استحقاق ثابت کر سکیں جو دور اول کے مسلمانوں نے اپنے عمل سے ثابت کیا تھا۔

اللہ کی مدد کی بے شمار صورتیں ہیں۔ یہ اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ کس صورت سے کس کے لیے اپنی مدد بھیجے گا۔ تاہم یہ یقینی ہے کہ جو لوگ اللہ پر سچا ایمان لائیں اور اس کے لیے مطلوبہ عمل کریں، ان کے حق میں اللہ کی مدد ضرور آتی ہے، خواہ وہ ایک صورت میں آئے یا دوسری صورت میں۔

اصلی معیار

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مریم کے یہاں جب حضرت مسیحؑ کی ولادت ہوئی اور وہ اشارۂ ربانی کے مطابق بچہ کو لے کر یہودیوں کی بستی میں آئیں تو یہودی علماء ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انھوں نے کہا کہ اے مریم، تم نے بڑا طوفان کر ڈالا۔ اے ہارون کی بہن، نہ تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی (مریم ۲۷ - ۲۸)

یہودی علماء کے اس کلام سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا پرست اور حق پسند لوگ تھے۔ وہ لوگوں کو برائی سے روکنے والے اور انھیں نیکی کا حکم دینے والے تھے۔ اس کے باوجود وہ اللہ کے یہاں خدا پرست اور حق پسند مانے نہیں گئے، اور نہ انھیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرنے والا قرار دیا گیا۔ اس کے بجائے وہ خدا کی نظر میں ملعون ٹھہرے اور عذاب کے مستحق قرار پائے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے "حضرت مریم" کے خلاف تقریر کرنے میں تو حق پسندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مگر جب خود اپنے آپ کو حق پسند بنانے کا وقت آیا تو وہ اپنے آپ کو حق پسند بنانے پر راضی نہ ہو سکے۔ دوسرے کے معاملہ میں وہ بظاہر مصلح تھے، مگر اپنی ذات کے معاملہ میں وہ سرکش اور مفسد بن گئے۔

ان کی ذات کا یہ امتحان اس وقت ہوا جب کہ حضرت مسیح، جو کہ ابھی نو مولود بچہ کی حیثیت سے ماں کی گود میں تھے، اچانک معجزۂ الٰہی کے تحت بول پڑے اور اپنے بارہ میں سچے نبی ہونے کا اعلان کیا۔ اس معجزاتی واقعہ نے حضرت مریم کی برأت اور حضرت مسیح کی نبوت دونوں کو آخری حد تک ثابت کر دیا۔ مگر یہودی علماء نے نہ حضرت مریم کی پاک دامنی کا اعتراف کیا اور نہ حضرت مسیح کی نبوت کا۔

دوسروں کے سامنے تقریر کرنے میں مصلح اور حق پسند ہونا کسی کو مصلح اور حق پسند نہیں بناتا۔ مصلح اور حق پسند صرف وہ ہے جو اپنی ذات کے معاملہ میں مصلح اور حق پسند ثابت ہو۔

خیر کثیر

عبداللہ بن عباس رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چچا کے لڑکے تھے۔ نوجوانی کی عمر میں ایک بار وہ اونٹ پر رسول اللہ ؐ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے ان کو ایک لمبی نصیحت فرمائی۔ اس حدیث کا ایک حصہ یہ ہے :

اعلم ان فی الصبر علیٰ ما تکرہ خیراً کثیراً۔ وان النصر مع الصبر وان الفرج مع الکرب وان مع العسر یسراً۔ (مسند الامام احمد)

جان لو کہ ناپسندیدہ بات پر صبر کرنے میں بہت زیادہ بھلائی ہے۔ اور صبر کے ساتھ اللہ کی مدد ہے۔ اور تکلیف کے ساتھ کشادگی ہے اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

یہ پیغمبرانہ الفاظ زندگی میں کامیابی کی حقیقت کو بتا رہے ہیں۔ ایسی حقیقت جس کا تعلق ذاتی زندگی سے بھی ہے اور قومی اور اجتماعی زندگی سے بھی۔

آپ کو ایک گھر یا ایک دکان یا ایک آفس چلانا ہے تو لازماً اس میں ایسی چیزیں سامنے آئیں گی جو آپ کو پسند نہ ہوں گی۔ ان ناپسندیدہ چیزوں پر اگر آپ بھڑک اٹھیں یا بے برداشت ہو جائیں تو آپ کبھی گھر یا دکان یا آفس کو چلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر آپ وقتی ناپسندیدگی کو برداشت کریں اور جذباتی ہیجان سے ہٹ کر عقلی فیصلہ کے تحت کام کریں تو یقیناً آپ اپنے مستقبل کو کامیابی کی طرف لے جائیں گے۔

یہی معاملہ قومی اور اجتماعی زندگی کا بھی ہے۔ قومی زندگی میں بھی دوسروں کی طرف سے ناخوشگوار باتیں پیش آتی ہیں۔ اشتعال انگیز الفاظ کان میں پڑتے ہیں۔ ان مواقع پر دوبارہ صبر ہی کامیابی کا واحد راستہ ہے۔ اگر ایک گروہ کے لوگ دوسرے گروہ کی ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز نہ کریں، اور ہر ناپسندیدہ بات پیش آنے پر دوسرے گروہ سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ایسے بے برداشت لوگ ہمیشہ ناکام اور برباد رہیں گے۔ پیغمبر کی نصیحت کے مطابق، کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ ایسے مواقع پر اپنے منفی جذبات کو قابو میں رکھا جائے۔ دوسروں کے خلاف اٹھنے کے بجائے اپنے آپ کو دبایا جائے۔ یہ صابرانہ طریقہ تنگی کے بعد کشادگی لائے گا، وہ مشکل کو بالآخر آسانی میں تبدیل کرنے کا سبب بن جائے گا۔

اسلام کا طریقہ

موجودہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کو اپنے قول و عمل کی آزادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک اور دوسرے کے درمیان مقابلہ اور ٹکراؤ پیش آتا ہے جو بعض اوقات عداوت تک پہونچ جاتا ہے (البقرہ ۳۶) ایسی حالت میں کرنے کا کام کیا ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلا حفاظتی انتظام وہ ہے جو خود خالق نے پیشگی طور پر کر رکھا ہے۔ اس نے ایسے داخلی اسباب پیدا کر دیئے ہیں کہ لوگوں کی عداوتی نفسیات عام حالت میں سوئی ہوئی رہتی ہے۔ انسان کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ سوئے ہوئے کو سویا ہوا رہنے دے۔ یہی وہ بات ہے جو حدیث میں ان لفظوں میں کہی گئی ہے کہ فتنہ سویا ہوا ہے، اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو اس کو جگائے (الفتنة نائمة لعن الله من ايقظها)

۲۔ تاہم احتیاط کے باوجود اگر فتنہ جاگ اٹھے تو اس وقت اس کو دوبارہ ختم کرنے کی اولین کارگر تدبیر یہ ہے کہ آدمی جوابی اشتعال میں مبتلا نہ ہو۔ وہ اس کے معاملہ میں خاموشی اور اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اکثر حالات میں صرف خاموشی اور اعراض اس کو ختم کرنے کے لیے کافی ہوجاتا ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت عمر فاروق کی یہ نصیحت نہایت بامعنی ہے کہ باطل کو ہلاک کرو اس کے بارہ میں چپ رہ کر (اميتوا الباطل بالصمت عنه)

۳۔ اگر بالفرض جاگی ہوئی عداوت صرف خاموشی اور اعراض سے ختم نہ ہو تو اس کے بعد دوسری موثر تدبیر قرآن میں یہ بتائی گئی کہ برائی کے جواب میں بھلائی کا انداز اختیار کیا جائے۔ اخلاق کی اس قسم میں تسخیر کی طاقت ہے، وہ دشمن کو بھی دوست بنا دیتا ہے (حم السجدہ ۳۴)

۴۔ بعض استثنائی واقعات میں ایسا ہوسکتا ہے کہ یہ فطری تدبیر بھی کارگر ثابت نہ ہو۔ اس وقت مظاہرۂ طاقت کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ طاقت کا استعمال اب بھی نہ کیا جائے۔ صرف یہ کیا جائے کہ طاقت کے مظاہرہ سے فریق ثانی کو اتنا مرعوب کیا جائے کہ وہ مخالفانہ اقدام سے رک جائے (الانفال ۶۰)

۵۔ اگر سنجیدہ کوشش کے باوجود یہ تمام تدبیریں ناکام ہوجائیں اور فریق ثانی سے مقابلہ بالکل ناگزیر ہوجائے تو اس وقت اپنے دفاع میں حسب استطاعت مقابلہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

تجارتی کامیابی

امریکہ کے تاجر اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے ہر قابل قیاس اور ناقابل قیاس تدبیریں کرتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ضرورت کی تمام چیزیں قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ویکوم کلینر ہو یا کئی ایکڑ آراضی پر پھیلی ہوئی عالی شان عمارت، موٹر کار ہو یا جیٹ طیارہ، ہر چیز آسان قسطوں پر حاصل کی جاسکتی ہے۔ حتی کہ امریکیوں کے درمیان یہ کہاوت عام ہوگئی ہے کہ اگر آپ کے اندر اقساط ادا کرنے کی استطاعت ہو تو آپ امریکہ کو بھی خرید سکتے ہیں بشرطیکہ وہ بک رہا ہو۔

امریکہ کے تجارتی ادارہ کی ایک اہم ترین خصوصیت وہ ہے جس کو گاہک نوازی کہا جاتا ہے۔ امریکہ کے بڑے بڑے تاجر ہمہ وقت اس کوشش میں رہتے ہیں کہ وہ اپنے گاہک کو خوش کریں اور انھیں اپنے بارے میں مطمئن کرسکیں۔

اسی گاہک نوازی کے اصول کا ایک مظاہرہ یہ ہے کہ کسی تجارتی ادارہ کی ایک شاخ سے خریدا ہوا مال، ناقص ہونے یا پسند نہ آنے کی صورت میں ادارے کی کسی بھی شاخ کو، کسی بھی شہر میں، یہ کہہ کر لوٹایا جاسکتا ہے کہ خریدنے کے بعد پسند نہیں آیا۔ نہ جھنجھلاہٹ نہ استفسار۔ بس رسید پاس ہونی چاہیے۔ قیمت فی الفور لوٹا دی جاتی ہے۔ " خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا" کا لفظ امریکی کاروباری لغت کے لیے اجنبی ہے۔

اگر ہندستان میں کچھ لوگ ایسا کریں کہ وہ ایک لمیٹڈ کمپنی یا کواپریٹو سوسائٹی قائم کریں اور مشترکہ سرمایہ سے ہندستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ڈیپارٹمنٹل اسٹور کھولیں جہاں ہر طرح کا سامان بکتا ہو، اور یہ ضمانت دیں کہ کسی بھی اسٹور سے خریدا ہوا سامان کسی بھی اسٹور پر واپس کیا جاسکتا ہے تو ایسے کاروبار کی سارے ہندستان میں دھوم مچ جائے گی۔ اور وہ یقینی طور پر زبردست کامیابی حاصل کرے گا۔

یہ تجارتی میدان اس ملک میں مکمل طور پر خالی ہے۔ یہاں کسی کے لیے اجارہ داری کی حد تک کامیابی کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ تاہم اس امکان سے وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں جن کے اندر یہ ضروری صفات پائی جاتی ہوں محنت، دیانت داری اور اشتراک عمل۔

اصلاحی کام

۲۸ اگست ۱۹۸۹ کا واقعہ ہے۔ تین صاحبان ملاقات کے لیے ہمارے دفتر (نئی دہلی) میں آئے۔ یہ تینوں بہار (مظفر پور) سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نام یہ ہیں:

محمد مطیع الرحمٰن چترویدی (۴۰ سال)، محمد ابراہیم (۵۰ سال)، محمد داؤد (۴۰ سال)

یہ لوگ "تبلیغی تحریک" کے انداز پر "اصلاحی تحریک" چلا رہے ہیں۔ وہ یکم اگست کو اپنے وطن سے نکلے۔ بہار اور یوپی کے مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے وہ دہلی پہونچے۔ ایک ماہ کے دوران وہ تقریباً سو بستیوں میں گئے اور لوگوں سے ملاقاتیں کیں۔

مظفر پور سے مذکورہ تین آدمی چلے تھے۔ اس کے بعد اور آدمی ان سے ملتے گیے۔ یہاں تک کہ ان کا قافلہ ۳۵ آدمیوں پر مشتمل ہو گیا۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنا برتن اور سامان خوراک ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ مسجدوں میں قیام کرتے ہیں۔ ہر آدمی اپنا خرچ خود ادا کرتا ہے۔ جہاں پہونچتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے حالات معلوم کرتے ہیں۔ اور پھر ان کے معاملات میں عملی مداخلت کر کے انھیں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس ایک مہینہ کے سفر میں انھوں نے بہت سے اصلاحی کام کیے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ بیوہ خاتون کا نکاح کرایا۔ ایک جگہ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ جہیز وغیرہ کے بغیر شادی کریں۔ چنانچہ کئی لوگ تیار ہوئے اور بالکل سادہ طور پر ان کی شادیاں کرائیں۔ لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ کم مہر مقرر کریں اور مہر معجل کے اصول پر اس کو بوقت نکاح ادا کر دیں۔ کہیں دو مسلمانوں میں جھگڑا قائم تھا۔ اس کو ختم کرا کر دونوں کے درمیان صلح کرائی۔ ایک جگہ مسجد کی تقسیم کر کے دو جماعتیں جاری ہو گئی تھیں۔ وہاں تقسیم کو ختم کرایا اور ایک جماعت جاری کرائی۔ وغیرہ وغیرہ

یہ بلاشبہ عین اسلامی کام ہے۔ جس طرح تبلیغی جماعت "کلمہ ونماز" کے میدان میں کام کر رہی ہے، اسی طرح مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کے لیے وسیع پیمانہ پر تحریک چلائی جائے۔ اس کا انداز کار وہی ہو جو تبلیغی جماعت کا انداز کار ہے۔ مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح اسی طرح کی عملی کوششوں سے ہوگی نہ کہ تقریروں اور جلسوں کی دھوم مچانے سے۔

ایک پروگرام

ڈاکٹر ایم سی شرما (عمر ۸۱ سال) سے ۱۹ جولائی ۱۹۸۹ کو ملاقات ہوئی ۔ وہ آر ایس ایس سے تعلق رکھتے ہیں ۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی پیدائش چورو (راجستھان) میں ہوئی ۔ اسکول میں طالب علمی کے زمانہ میں وہ آر ایس ایس سے وابستہ ہوئے ۔ وہ اس کے ایک کٹر ممبر تھے ۔ ان کا خیال یہ ہو گیا کہ ہندستان کی تمام مصیبتوں کے ذمہ دار گاندھی تھے ۔ وہ گاڈسے کو ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگے جس نے ۱۹۴۸ میں گاندھی جی کو گولی مار کر قتل کر دیا۔

وہ اپنے انھیں انتہا پسندانہ خیالات پر تھے کہ ۱۹۷۵ میں سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی نے ہندستان میں ایمرجنسی نافذ کی ۔ آر ایس ایس کے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا ۔ انھیں میں سے ایک ڈاکٹر شرما بھی تھے۔ انھوں نے بتایا کہ جیل کی نظر بندی کے زمانہ میں ان کے پاس کوئی کام نہ تھا ۔ چنانچہ انھوں نے مہاتما گاندھی کا مطالعہ شروع کر دیا ۔ گاندھی جی کی کتابیں جیل میں آسانی کے ساتھ دستیاب تھیں ۔ اس لیے مطالعہ کو جاری رکھنے میں انھیں کوئی دقت پیش نہیں آئی ۔

انھوں نے بتایا کہ اس مطالعہ نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا ۔ جب میں جیل سے نکلا تو میں ایک بالکل بدلا ہوا انسان تھا ۔ اب میرا خیال یہ ہے کہ گاندھی اس ملک کے سب سے بڑے رہنما تھے ۔ ساور کر جیسے لوگ جدید ہندستان کے رہنما نہیں بن سکتے تھے ۔ اس کام کو کرنے کے لیے گاندھی اور نہرو جیسے لوگ درکار تھے ۔

ڈاکٹر شرما کی روداد سننے کے بعد مجھے یہ خیال آیا کہ ہندستان میں کرنے کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ شہر سے الگ کسی پرسکون مقام پر ایک مرکز بنایا جائے ۔ یہاں اسلام کو سمجھنے اور اس کا مطالعہ کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں جدید معیار پر موجود ہوں ۔ اسی کے ساتھ وہاں قیام کا اچھا بندوبست ہو ۔ اس کے بعد تعلیم یافتہ ہندو نوجوانوں کو یہاں بلایا جائے ، اور چند دن یا چند ہفتہ ٹھہرا کر انھیں اسلام سے واقف کرانے کی کوشش کی جائے ۔ اگر ایسا مرکز قائم کیا جا سکے تو اس سے وہی فائدہ زیادہ بڑے پیمانہ پر حاصل ہو گا جو ڈاکٹر شرما کے حق میں جیل کا ہوا ۔

اگر ایسا مرکز قائم ہو تو وہ ہندو نوجوانوں کو اسلام سے قریب کرنے کا ذریعہ ثابت ہو گا ۔ یہاں تک کہ یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ مرکز اس ملک میں اسلام کی جدید تاریخ بنانے کا دروازہ کھول دے ۔

ضمیر کی طاقت

ابوالبرکات علوی (۶۳ سال، نظام پور ضلع اعظم گڈھ (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ ۲۹ اگست ۱۹۸۹ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے علاقہ کا ایک واقعہ بتایا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

اعظم گڈھ کے شمال مغرب میں ایک گاؤں ریدا ہے جو مجھوئی ندی کے کنارے فیض آباد کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں چار گھر مسلمانوں کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے دو سو گھر آباد ہیں۔ نومبر ۱۹۸۷ میں ایسا ہوا کہ باہر سے ایک نیل گائے آیا اور گنے کے کھیت میں داخل ہو گیا۔ ایک مقامی مسلمان جھنو درزی نے چاہا کہ اس کا شکار کیا جائے۔ انھوں نے پڑوس کے گاؤں مخدوم پور میں ایک مسلمان کو اس کی خبر کی جس کے پاس بندوق ہے۔ وہ اپنی بندوق لے کر آئے اور نیل گائے پر فائر کیا۔

اگر نیل گائے موقع پر مر گیا ہوتا تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر نشانہ صحیح نہیں لگا۔ نیل گائے زخمی ہو گیا اور خون بہاتا ہوا بھاگا۔ ہندوؤں نے جب جابجا خون دیکھا تو وہ مشتعل ہو گئے۔ ان کو معلوم ہوا کہ جھنو درزی نے مخبری کر کے نیل گائے پر گولی چلوائی ہے تو انھوں نے گاؤں میں پنچایت کی اور جھنو کو بلا کر اس کو یہ سزا سنائی کہ تم نے جو قصور کیا ہے اس کے بدلے تمہارے اوپر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔

اس گاؤں میں کوئی مسلم لیڈر جھنو درزی کو بھڑکانے کے لیے موجود نہ تھا اور نہ مسلمانوں کا وہاں کوئی زور تھا جو جھنو درزی کو جھوٹے بھرم میں مبتلا کرے۔ چنانچہ فطرت نے جھنو درزی کی رہنمائی کی۔ وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کہا: پنچوں کا فیصلہ مجھ کو منظور ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس نقد روپیہ موجود نہیں۔ مگر میں اپنے گھر کا سامان بیچ کر اس کو ادا کروں گا۔

تین دن گزرے تھے کہ ہندوؤں کا ضمیر جاگ اٹھا۔ انھوں نے دوبارہ اپنے لوگوں کی پنچایت بلائی۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ یہاں مسلمان بہت تھوڑے اور کمزور ہیں۔ باہر کے لوگ جب سنیں گے کہ ہم نے ان سے جرمانہ وصول کیا ہے تو وہ ہم لوگوں کو بہت گرا ہوا سمجھیں گے اور ہماری بے عزتی ہوگی کہ ہم نے مسلمانوں کو کمزور پا کر انھیں دبا لیا۔ اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ جھنو درزی سے جرمانہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ اس متفقہ فیصلے کے مطابق جھنو درزی کا جرمانہ معاف کر دیا گیا۔

اسلام کی تصدیق

امریکی خواتین میں آج کل ایک نئی تحریک ابھر رہی ہے جس کو تحریک نسواں ثانی (Women's Movement II) کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علم برداروں کے دعوے کے مطابق، یہ قدیم تحریک نسواں ہی کی توسیع ہے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ قدیم تحریک نسواں ایک غیر حقیقی تحریک تھی، اس لیے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ ایک مبصر نے بجا طور پر اس کو تحریک میں ایک خاموش تبدیلی (quiet shift) قرار دیا ہے۔ امریکی ماہنامہ اسپان (Span) جولائی ۱۹۸۹ میں اس تحریک کا تعارف شائع ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ موجودہ امریکہ کی عورتیں بدحالی کا شکار ہیں۔ کام کرنے والی عورتوں کی دو تہائی تعداد ۱۳۰۰۰ ڈالر سالانہ سے کم کماتی ہے جو امریکہ میں زندگی گزارنے کے لیے ناکافی ہے۔ حمل، بچوں کی نگہداشت اور دوسرے نسوانی مسائل نے عورت کو سخت پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ واضح ہو کہ امریکہ میں ۲۵۔۴۴ سال کے درمیان کی عورتوں کی ۷۰ فی صد تعداد دفتروں اور کارخانوں میں کام کرتی ہے۔ مگر عورتوں کو عام طور پر مردوں سے کم تنخواہ ملتی ہے۔ بڑے عہدے انہیں حاصل نہیں۔

تحریک نسواں اول کا سارا زور اس پر تھا کہ عورت اور مرد ہر اعتبار سے برابر ہیں۔ عورتوں کو اگر آزادی مل جائے تو وہ مردوں ہی کی طرح اپنی زندگی کی تعمیر کر سکتی ہیں۔ عورتوں کو مکمل آزادی مل گئی۔ مگر اب معلوم ہوا کہ عورت کو آزادی کے ساتھ تحفظ (protection) کی ضرورت ہے۔ صرف اپنی ذاتی بنیاد پر وہ کھڑی نہیں ہو سکتی۔

تحریک نسواں دوم کی ایک خاتون لیڈر طار وہلم (Tarr-Whelam) نے کہا کہ ——— یہ بات واضح ہے کہ عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے اب ریاستیں ہی ہمارے لیے عمل کا مقام ہیں :

But it is clear that to win women's rights, the states are now the place for action (p. 37).

مغربی عورت نے پہلے برابری کا حق مانگا تھا۔ اس کو برابری کا حق مل گیا۔ اب اس کو معلوم ہوا کہ صرف برابری کا حق کافی نہیں۔ اس کو اسی کے ساتھ مزید سپورٹ کی ضرورت ہے۔ وہ گھریلو قوام کو اپنا قوام بنانے پر راضی نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کو حکومت کو اپنا قوام بنانا پڑا۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ زمانہ آج اسلام کے موافق سمت میں جا رہا ہے۔ انسان کے تجربات

اس کو اس طرف لے جا رہے ہیں کہ وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جائے کہ خدا کا قانون ہی زندگی کا صحیح قانون ہے۔

تجربہ کے بعد

ایک امریکی خاتون لنڈا برٹن (Linda Burton) نے اپنے خاندانی تجربات پر ایک کتاب لکھ کر شائع کی ہے جس کا نام ہے ـــــ تمہارے جیسی ایک تیز عورت گھر پر رہ کر کیا کام کرتی ہے :

What's a Smart Women Like You Doing at Home?

مذکورہ خاتون کی کہانی کا خلاصہ، ان کے لفظوں میں یہ ہے کہ میرا گھر پر رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں ایک کمپنی میں پورے وقت کی ملازم تھی۔ ۳۳ سال کی عمر میں میرے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس کو سنبھالنے میں مجبورانہ طور پر مجھے اپنی ملازمت چھوڑنی پڑی۔ یہاں تک کہ میرے لیے معاشی مسائل پیدا ہو گئے۔ اور میں نے دوبارہ باہر کا کام کرنا شروع کر دیا۔

میں اپنے بچے کے لیے شام کا وقت اور ہفتہ کی چھٹی کا دن دے سکتی تھی۔ مگر وہ ناکافی تھا۔ اب میں نے اس کے لیے تحفظ اطفال کا ایک ادارہ تلاش کیا۔ مگر ایک مہینہ کے بعد ہی اس کو ناقص سمجھ کر مجھے چھوڑ دینا پڑا۔ میں ملازمت ترک کر کے دوبارہ گھر پر رہنے لگی تاکہ بچے کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں دو سال تک کسی زیادہ بہتر ادارہ کی تلاش میں رہی۔ یہاں تک کہ میرے یہاں دوسرا بچہ پیدا ہو گیا۔

میں نے دوبارہ ایک ملازمت کر لی اور اپنے دونوں بچوں کو گھریلو قسم کے تحفظِ اطفال کے ادارہ میں ڈال دیا۔ مگر اس کی کارکردگی پر مجھے اطمینان نہ ہو سکا۔ آخر کار میں نے خود اپنے گھر پر انفرادی خدمات حاصل کیں۔ میں نے پایا کہ آپ خواہ کتنا ہی قاعدہ قانون بنائیں۔ کتنا ہی زیادہ رقم خرچ کریں مگر یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے کے لیے محبت کر سکے :

> In time, my search for child care taught me a critical lesson: no matter how many licences we issue, how many guidelines we establish or how much money we pay, it is impossible to have quality controls over the capacity of one human being to love and care for another (p. 94).

میں ایک ایسا شخص چاہتی تھی جو نرم مزاج اور محبت کرنے والا ہو۔ جو مستعد اور کسی قدر پُرمزاح ہو۔ ایک زندہ شخص جو میرے بچوں کی تخلیقیت کو بڑھائے، وہ ان کو تفریح کے لیے باہر بھی لے جائے۔ وہ ان کے تمام چھوٹے چھوٹے سوالوں کا جواب دے۔ وہ ان کو میٹھی نیند سلائے۔ آہستہ آہستہ اور تکلیف دہ

طور پر میں اس حیرت ناک واقفیت تک پہونچی کہ جس شخصیت کو میں برسوں سے تلاش کر رہی تھی وہ میری اپنی ناک کے نیچے موجود ہے، یعنی میں خود۔ یہ ہے وہ کام جو میرے جیسی تیز عورت اپنے گھر کے اندر کر رہی ہے:

I had wanted someone who was loving and tender, with a sense of humour and an alert, lively manner — somebody who would encourage my children's creativity, take them on interesting outings, answer all their little questions, and rock them to sleep. Slowly, painfully, I came to a stunning realization: the person I was looking for was right under my nose. I had desperately been trying to hire me. And that's what a smart woman like me is doing at home.

Reader's Digest, August, 1988

مذہب کی تعلیم کے تحت معاشرت کا یہ اصول مقرر کیا گیا تھا کہ مرد کمائے اور عورت گھر کی دیکھ بھال کرے۔ اس طرح تقسیم کار کے اصول پر دونوں زندگی کا کاروبار چلائیں۔

یہ ایک انتظامی بندوبست تھا نہ کہ کسی کو بڑا درجہ اور کسی کو چھوٹا درجہ دینا۔ مگر جدید دور میں "آزادیٔ نسواں" کی تحریک اٹھی جس نے اس طریقہ کو عورت کی تصغیر کے ہم معنی قرار دیا۔ اور یہ نعرہ دیا کہ دونوں صنفوں کو کسی تقسیم یا حد بندی کے بغیر ہر کام کرنا چاہیے۔ یہ نظریہ اتنا پھیلا کہ عورتوں کی ایک پوری نسل گھر سے باہر نکل پڑی۔

نام نہاد مساوات کے اس تجربہ پر اب تقریباً سو سال بیت چکا ہے۔ خاص طور پر مغربی دنیا میں اس کا تجربہ آخری ممکن حد تک کیا گیا ہے۔ مگر ان تجربات نے اس کی افادیت ثابت کرنے کے بجائے صرف اس کا نقصان ثابت کیا ہے۔ موجودہ مغربی معاشرہ میں مختلف انداز سے مسلسل اس کی مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ انھیں میں سے ایک مثال وہ ہے جس کو اوپر نقل کیا گیا۔

مذہب نے مرد اور عورت کے عمل کے درمیان یہ تقسیم رکھی تھی کہ مرد معاش فراہم کرے، اور عورت نئی نسل کی اخلاقی تعمیر کرے:

Man the bread-earner, woman the character-builder

جدید تہذیب نے اس مذہبی تعلیم سے انحراف کیا۔ مگر جدید تہذیب کے تجربات نے صرف یہ کیا ہے کہ اس نے مذہب کی تعلیمات کی صداقت کو از سر نو مزید قوت کے ساتھ ثابت کر دیا ہے۔

عورت جنگ میں

روسی زبان میں ایک کتاب عورتوں کے بارہ میں چھپی ہے جس کا انگریزی ترجمہ ماسکو سے شائع کیا گیا ہے۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے :

S. Alexiyerich, *War's Unwomanly Face*, Progress Publishers, Moscow

دوسری عالمی جنگ (۱۹۴۱) چھڑی تو روسی حکومت نے اپنے شہریوں سے جذباتی اپیلیں کیں اور مادر وطن (Motherland) کو بچاؤ کا نعرہ دیا۔ اس سے متاثر ہو کر جو روسی نوجوان فوج میں بھرتی ہوئے ان میں ۸ لاکھ (800,000) عورتیں تھیں جن کی عمریں ۱۵-۱۶ سال کے درمیان تھیں۔ مذکورہ کتاب انھیں خواتین سے متعلق ہے۔ خاتون مصنف نے اپنی ۴ سالہ تحقیق کے دوران ایک سو شہروں کا سفر کیا، انھوں نے دو سو شریک ہونے والی عورتوں کا انٹرویو لیا۔

یہ کتاب مذکورہ عورتوں کے بارے میں بہت سبق آموز معلومات پیش کرتی ہے۔ مثلاً کتاب میں بتایا گیا ہے کہ جنگ کے بعد اکثر عورتوں نے اس حقیقت کو چھپانا شروع کیا کہ وہ جنگ میں شریک ہوئی تھیں۔ "ہم نے چاہا کہ دوبارہ عام لڑکیوں کی طرح ہو جائیں، شادی کے قابل لڑکیاں":

We wanted to become ordinary girls again. Marriageable girls.

کتاب کی مصنف جنگ میں شریک ہونے والی ایک تعلیم یافتہ خاتون سے ملیں جن کا نام ویرا سفرمونا ڈوڈوا (Vera Safrmovna Davdova) تھا۔ انھوں نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات کتاب کے بیان کے مطابق، یہ تھی کہ وہ یقین رکھتی ہیں کہ جنگ میں عورتوں کا ردّ عمل مکمل طور پر مردوں سے مختلف تھا۔ مردوں کا فیصلہ کسی تجربہ کے بارے میں زیادہ وقتی اور مبنی برحقیقت ہوتا تھا۔ جب کہ عورتیں بہت زیادہ جذباتی انداز میں اپنا ردّ عمل ظاہر کرتی تھیں :

She believes that women reacted to war in a completely different way from men. The men were more matter-of-fact and casual about the experience, whereas the women reacted in an overwhelmingly emotional manner.

موجودہ زمانہ میں عورتوں کی فطرت اور ان کی پیدائشی صلاحیت کے بارہ میں کثرت سے تحقیقات کی گئی ہیں۔ عورت کی صنف کو خالص سائنسی اعتبار سے سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحقیقات کے ذریعہ جو باتیں معلوم ہوئی ہیں وہ حیرت انگیز طور پر عورت کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہیں۔

جدید تحقیقات نے بتایا ہے کہ عورت پیدائشی طور پر زود حس ہے۔ وہ مرد کے مقابلہ میں جذباتی (Emotional) واقع ہوئی ہے۔ یہ دریافت واضح طور پر بتاتی ہے کہ عورتوں کو زندگی کے ایسے شعبوں میں داخل کرنا درست نہیں جہاں ٹھنڈے ذہن کے تحت فیصلہ کرنے کی ضرورت ہو۔ جہاں حالات کا تاثر قبول کیے بغیر رائے قائم کرنا پڑے۔ جہاں "مردانگی" کی ضرورت ہو نہ کہ "نسوانیت" کی۔

سیاست کا شعبہ، جنگ کا میدان، بین اقوامی معاملات، عدالتی قضیے، بڑے بڑے صنعتی منصوبے، اس طرح کے تمام شعبوں میں ذہنی ڈسپلن اور غیر جذباتی فیصلوں کی شدید ضرورت ہوتی ہے۔ ان امور میں وقتی محرکات سے اوپر اٹھ کر رائے قائم کرنا پڑتا ہے۔ اور ایسے تمام مواقع پر عورتیں اپنی فطری جذباتیت کی بنا پر غیر موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ جب کہ مرد نسبتاً غیر جذباتی ہونے کی بنا پر زیادہ بہتر ردعمل پیش کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں۔

عورت اور مرد کا یہی پیدائشی فرق ہے جس کی بنا پر اسلام میں دونوں کا میدان کار الگ الگ رکھا گیا ہے۔ یہ درجہ کے فرق کی بات نہیں ہے بلکہ عمل کے میدان میں فرق کی بات ہے۔ یہ تفریق سائنسی تحقیقات کے عین مطابق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں نام نہاد آزادیٔ نسواں کے علمبرداروں کا طریقہ غیر سائنسی ہے نہ کہ اسلام کا طریقہ۔

ایک کتاب

لندن سے مذاہب کی ایک مختصر انسائیکلو پیڈیا چھپی ہے۔ اس میں مختلف مغربی علماء کے ۲۴ مقالات درج ہیں۔ ماقبل تاریخ سے لے کر اب تک کے تمام مذاہب کی معلومات نہایت سلیقہ کے ساتھ جمع کی گئی ہیں۔ بڑی تعداد میں تاریخی تصویریں شامل ہیں۔ طباعت اور ترتیب کی موزونیت نے کتاب کو ایک خوبصورت البم بنا دیا ہے۔ کتاب کا نام یہ ہے:

Man and His Gods, The Hamlin Publishing Group Ltd., London, 1974, pp. 440

قدیم زمانہ میں مذہب پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ یا تو کسی مذہب کی موافقت میں ہوتی تھیں یا اس کی مخالفت میں۔ مذاہب کا غیر جانب دارانہ تاریخی تعارف قدیم زمانہ میں ایک لامعلوم چیز تھی۔ موجودہ زمانہ میں جو چیزیں پیدا ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذاہب اور دوسرے موضوعات پر اس انداز سے کتاب لکھی جاتی ہے گویا لکھنے والا اپنے موضوع پر کوئی موافق یا مخالف رائے نہیں رکھتا، وہ صرف ایک قلمی کیمرہ کا فرض انجام دے رہا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی اصل صورت حال کی تصویر کشی سے ہے نہ کہ اس کے بارے میں اپنی کوئی رائے دینے سے۔

زیر نظر کتاب بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہے چنانچہ اس کے مرتب نے کتاب کا خاتمہ حسب ذیل سطروں پر کیا ہے: "اس انسائیکلو پیڈیا نے حقائق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا کام حکم لگانا یا کوئی معیار قائم کرنا نہیں، اس نے صرف سچائی کو پیش کر دیا ہے (صفحہ ۴۳۱)

قدیم طرز کی متکلمانہ کتابیں "پروپیگنڈا لٹریچر" سمجھی جاتی ہیں۔ مگر اس طرز تصنیف نے آج کے متکلمین کو موقع دیا ہے کہ وہ بظاہر لوگوں کو علوم کی تدوین کرتے ہوئے نظر آئیں، حالانکہ حقیقۃً وہ اپنا کلامی لٹریچر تیار کر رہے ہوں۔ پھر یہی کتابیں تعلیم گاہوں میں عمومی نصاب کے طور پر داخل ہوں۔ لائبریریوں کے ریفرنس سکشن میں سجائی ہوئی ہوں۔ علمی تحقیق کے لئے ان کا مطالعہ کیا جائے۔

اس طرز تصنیف کے رواج سے یہودیوں اور عیسائیوں نے کافی فائدہ اٹھانے کی کوشش

کی ہے۔ وہ انداز ترتیب کے لحاظ سے مکمل طور پر غیر جانب دار رہ کر مذہب اور تاریخ کے موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں۔ ان کو آدمی اس طرح پڑھتا ہے گویا کہ وہ ایک موضوع کا علمی مطالعہ کر رہا ہے نہ کہ اس کے بارے میں کسی موافق یا مخالف کا تبصرہ پڑھ رہا ہے۔ پھر نہایت ہوشیاری سے وہ اس کے بین السطور میں اپنا نقطۂ نظر شامل کر دیتے ہیں۔

اس انسائیکلوپیڈیا میں جس کے ایک مقالہ نگار ہندو اور باقی سب یہودی یا عیسائی ہیں، اسلام کے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ بظاہر اس میں اسلام کی دعوتی، تہذیبی اور سیاسی کامیابیوں کا فیاضانہ اعتراف موجود ہے۔ حتی کہ اس میں یہ جملہ بھی ہے کہ اسلام نے انسانی تاریخ کے رخ کو موڑ دیا :

Its advent changed the course of human history (p. 38).

اس کتاب میں تسلیم کیا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی اسلام نے پر امن ذرائع سے نئی کامیابیاں (new gains) حاصل کی ہیں۔ افریقہ میں تیزی سے نومسلموں کا اضافہ کسی تبلیغی کوشش سے زیادہ اسلام کی اپنی کشش کی بنیاد پر ہو رہا ہے (۴۰۴)، تاہم اس میں ایسی باتیں بھی ہیں جن کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ لکھنے والے نے یہ سطریں کیوں کر لکھیں۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۹۵ پر درج ہے :

" محمد کو اپنی زندگی میں عرب سے باہر کسی علاقہ کا قبضہ حاصل نہیں ہوا۔ کسی طرح یقین نہیں کیا جاسکتا کہ وہ سمجھتے ہوں کہ عربوں کے علاوہ بھی اسلام میں کسی کے لئے کوئی معنویت ہے۔ اگرچہ بعد کا مسلم نظریہ ان کے عالمی مقاصد کی توثیق کرتا ہے۔ تاہم اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں انھوں نے عرب کی بعض سرحدی عیسائی ریاستوں کے خلاف مہم بھیجی جو جزیرہ نما کے شمال میں واقع تھیں۔ ان مہموں نے مسلمانوں کو عظیم بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں سے ٹکرا دیا اور پیغمبر کی وفات کے جلد ہی بعد تیز رفتار اور دائمی فتح کا سبب بن گئیں "

اس پیراگراف نے اسلام کو اس سطح پر کھڑا کر دیا جہاں موجودہ مسیحیت ہے۔ بائبل کے مطابق، حضرت مسیح اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجے گئے (متی ۱۵ : ۲۴) مگر بعد کو سینٹ پال اور دوسرے مسیحی راہبوں نے کشف و رویا کا سہارا لے کر

مسیحیت کو عالمی بنا دیا۔ مگر پیغمبر اسلام کی بابت یہ بیان بالکل خلاف واقعہ ہے۔ قرآن میں صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ آپ تمام دنیا کے لئے ڈرانے والے (فرقان۔ ۱) بنا کر بھیجے گئے۔ آپ نے خود فرمایا کہ اُرسِلتُ الی الناس کافۃ (میں تمام دنیا کے لئے بھیجا گیا ہوں) آپ نے اپنی زندگی ہی میں عرب کے باہر دوسرے ملکوں کے بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ کئے۔ اور صریح طور پر پیشین گوئی فرمائی کہ اسلام عنقریب ساری دنیا میں پھیل جائے گا۔ وغیرہ۔

اسی طرح اس کتاب میں وہ غلطی بھی کی گئی ہے جو موجودہ زمانہ کے رواجی مطالعہ کی بنا پر اکثر مذہبی مصنفین کرتے ہیں۔ اسلام کسی تاریخ کا نام نہیں، وہ قرآن، رسول کی سنت اور آپ کے اصحاب کے چھوڑے ہوئے نمونہ کا نام ہے۔ اس لئے اسلام کے مطالعہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات، رسول کی ثابت شدہ سنت اور صحابہ کرام کی زندگیوں کو سامنے رکھ کر اسلام کو سمجھا جائے۔ اسلام صرف اسی چیز کا نام ہو جو ان معیاری ذرائع سے معلوم ہو۔ اس کے سوا کسی چیز کا نام اسلام نہ ہو۔ بعد کے دور میں اسلام کی جو تاریخ بنی، اس کو مذکورہ بالا معیار پر جانچا جائے اور اتنے ہی حصہ کو اسلام قرار دیا جائے جو اس معیار پر پورا اترے۔ باقی کو "انحراف" قرار دے کر اسلام کی حقیقی تاریخ سے الگ کر دیا جائے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مصنفین اس کے بجائے یہ کرتے ہیں کہ اسلام کے نام پر مسلمانوں میں جو کچھ بھی پایا جاتا ہے، اس کو اکٹھا کرتے ہیں اور اس پورے مجموعہ کو اسلام قرار دے دیتے ہیں۔ اس طرح توحید سے لے کر بزرگ پرستی تک ہر چیز کا نام اسلام ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر کبھی کسی "مسلمان" نے گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہو کر ایک تصویر بنائی جس میں دکھایا کہ فرشتہ ایک پردار خاتون کی شکل میں آیا ہے اور پیغمبر اسلام کو خدا کی وحی پہنچا رہا ہے۔ اس تصویر کو نہایت اہتمام سے اڈنبرا یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ کر دیا گیا اور کتاب میں اس کا فوٹو (۳۹۱) چھاپ دیا گیا۔ اسی طرح چودھویں صدی عیسوی میں کسی مسلمان یا عیسائی نے دو صاحب ریش بزرگوں کی تصویر بنائی اور ان کے سر پر پگڑی رکھی۔ ایک کو اونٹ پر بیٹھا ہوا دکھایا گیا، دوسرے کو گدھے پر۔ گدھے کے مسافر کے نیچے لکھ دیا "عیسیٰ" اونٹ کے مسافر کے لئے لکھ دیا: "محمد" یہ تصویر بھی اسلامی تاریخ کے ایک قیمتی صفحہ کی حیثیت سے (۴۳۱) اس کی زینت بن گئی۔ مسلمانوں میں

ایک گروہ پیدا ہوا جس نے دوسری قوموں کے اثر سے " وجد " کا نظریہ نکالا ۔ ایسے لوگوں کی ایک مجلس کا فوٹو دے لیا گیا (۴۱۱) اور دکھایا گیا کہ اسلام کے مطابق جب خدائی راگ چھیڑا جاتا ہے تو لوگوں کو وجد آجاتا ہے اور وہ کھڑے ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔

اسی طرح مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ بعض معاملات میں قرآن کے بیانات متضاد (contradictory) ہیں۔ مثال کے طور پر کبھی قرآن کہتا ہے کہ انسان کو عمل کی آزادی حاصل ہے، اور کبھی قرآن ہی یہ زور دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے کہ انسان کے تمام معاملات پر خدا کا مکمل کنٹرول قائم ہے (۴۰۷) قرآن کی بابت مقالہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ اس کے کسی ماقبل انسانی ماخذ کا ثبوت نہیں ملتا (۴۰۲) حتی کہ قرآن کی زبان بھی محمد کی اپنی روزمرہ کی زبان سے مختلف ہے (۳۹۸) پھر بھی معروف رواج کے مطابق انھیں تلاش ہے کہ سابق مذہبی کتابوں میں اس کا کوئی ماخذ مل جائے۔ وغیرہ

یہ باتیں بلاشبہ ہمارے لئے تکلیف دہ ہیں۔ مگر اس قسم کی جو کتابیں چھپ رہی ہیں، ان کا توڑ یہ نہیں ہے کہ ان کے خلاف ایک جلی کٹی تنقید لکھ کر چھاپ دی جائے یا ناشر اور مصنف کے نام احتجاجی تار روانہ کر دئے جائیں۔ اس قسم کی کوشش خدمت اسلام کا جھوٹا کریڈٹ لینے کے ہم معنی ہے۔ ان کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ کچھ خبریں اخبار میں چھپ جائیں اور وہ بھی دینی نقصان میں مالی نقصان کے اضافہ کی قیمت پر۔

کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ ان کتابوں کا علمی بدل فراہم کیا جائے۔ ہمارے درمیان اعلیٰ سطح پر ایسے ادارے قائم ہوں جو خود علوم کو نئے ڈھنگ پر مرتب کر ڈالیں۔ موجودہ قسم کی اشتہاری کتابوں کے بجائے وہ علمی طرز کی کتابیں تیار کریں۔ اسلام کی قلمی خدمت کے کام کو مناظرہ بازی یا دوسرے لفظوں میں " مذہب کے پروپگنڈہ لٹریچر " کی سطح سے اٹھا کر تدوین علوم کی سطح پر پہنچا دیں۔ وہ انسانی ذہن کو تحقیق و تصنیف کے اس مقام پر پہنچ کر خطاب کریں جہاں سے دوسرے لوگ اس کو خطاب کر رہے ہیں۔ دوسری کوئی بھی صورت اس فتنہ کے مقابلہ کی نہیں۔

سفرنامہ افریقہ ۔ ۳

۲۹ ستمبر ۱۹۸۹ کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ ۱۴ کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ راستہ میں جہاز ایک بار نیچے اوپر ہونے لگا۔ ہوائی جہاز کے ساتھ جب یہ صورت پیش آتی ہے تو اکثر وہ دو ہزار فٹ تک نیچے چلا جاتا ہے۔ مگر بلندی پر اڑتے ہوئے مسافر کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ۱۰۔۲۰ فٹ نیچے اوپر ہو رہا ہے۔ ہوائی جہاز جب ۳۰ ہزار فٹ کی اونچائی پر پہنچ جاتا ہے تو وہ اسی طرح ہلکا ہو جاتا ہے جیسے کوئی آدمی پانی پر تیرتے ہوئے اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرتا ہے۔ اس ہلکے پن کی وجہ سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ جہاز دو ہزار فٹ کے بقدر نیچے اوپر ہو رہا ہے۔

جہاز جب اس طرح ہلتا ہے اور جھٹکے کے ساتھ نیچے اوپر ہوتا ہے تو عام مسافر اس کو دیکھ کر گھبرا اٹھتے ہیں۔ مگر یہ کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کم از کم ہوا بازی کی تاریخ میں اب تک صرف اس کی وجہ سے کوئی جہاز حادثہ کا شکار نہیں ہوا۔

واپسی کے سفر میں ہماری پہلی منزل دمشق تھی۔ جہاز دمشق کے ہوائی اڈہ پر اترا تو اس "قدیم ترین شہر" کی نسبت سے بہت سی یادیں تازہ ہو گئیں۔

"دمشق" کے نام کے ساتھ اتنی زیادہ یادیں وابستہ ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ مکہ اور مدینہ کے بعد اصحاب رسول کی سب سے زیادہ تعداد جہاں مدفون ہے وہ شام، خاص طور پر دمشق ہے۔ اس کے علاوہ علماء اسلام اور مختلف قسم کی اسلامی شخصیتوں کی بہت بڑی تعداد یہاں مدفون ہے۔

دمشق نے اپنی تاریخ کے طویل دور میں بڑے عجیب عجیب منظر دیکھے ہیں۔ قدیم عہد کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو حضرت حسین کا سر کاٹ کر اسی دمشق میں یزید کے پاس لایا گیا۔ فتح اسپین (۷۱۱) کے چار سال بعد موسیٰ بن نصیر دمشق واپس آئے تو ان کے ساتھ تقریباً ۴۰۰ کی تعداد میں اسپینی شہزادے تھے جن کے سروں پر تاج تھے اور کمر میں سونے کے پٹکے بندھے ہوئے تھے۔ دمشق اُس قدیم تقریباً پانچ سوسالہ مسلم عہد کی یاد دلاتا ہے جب کہ دمشق سے لے کر فرانس کی سرحد تک عثمانی ترکوں کی حکومت قائم تھی، وغیرہ وغیرہ۔

جدید فلسطینی تحریک کے ایک لیڈر خلیل الوزیر تھے۔ ان کو عام طور پر ابو جہاد کہا جاتا تھا۔ وہ

فلسطین میں پیدا ہوئے۔ آخری دنوں میں وہ پی ایل او کے فوجی کمانڈر کی حیثیت سے تیونس میں مقیم تھے۔ ان کی تدفین دمشق میں ہوئی۔

ابوجہاد اپنی خطرناک سرگرمیوں کی وجہ سے اسرائیل کے لئے دردسر بنے ہوئے تھے۔ وہ اسرائیل کے خلاف فلسطینیوں کی گوریلا جنگ کے کمانڈر تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مارچ ۱۹۷۸ میں انھیں کے منصوبہ کے مطابق ایک اسرائیلی سڑک سے ایک بس کا اغوا کیا گیا تھا اور اس کے ۳۵ یہودی مسافر قتل کردئے گئے تھے۔

اس طرح کے مختلف واقعات کی بنا پر اسرائیل کے حکمراں ابوجہاد سے بگڑے ہوئے تھے۔ آخر کار ایک نہایت منظم منصوبہ کے تحت ۱۶ اپریل ۱۹۸۸ کو انھیں قتل کر دیا گیا۔ اس خفیہ منصوبہ کی تفصیل امریکی ہفتہ وار ٹائم ۲۵ اپریل ۱۹۸۸ اور ۲ مئی ۱۹۸۸ میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائم (۲ مئی ۱۹۸۸) کے مطابق اسرائیلی پارلیمنٹ کے ایک ممبر یوسی سرید (Yoshi Sarid) نے کہا کہ ایک کے بعد ایک ابوجہاد ختم کئے جاسکتے ہیں مگر یہ چیز فلسطینی مسئلہ کو ختم نہیں کر سکتی:

> Abu after Abu can be liquidated. But this will not liquidate the Palestinian problem (p.17).

ہندستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی نے جون ۱۹۸۸ کے پہلے ہفتہ میں شام کا دورہ کیا تھا۔ دمشق میں انھوں نے ۴ جون ۱۹۸۸ کو ایک تقریر کی۔ اس تقریر میں انھوں نے دمشق کی خصوصیت بتاتے ہوئے کہا کہ محمد بن قاسم یہاں سے روانہ ہو کر ہندستان پہنچے تاکہ وہاں اسلام کے پیغام کو پھیلائیں:

> Mohammad bin Qasim set sail from here to India to spread the message of Islam.

راجیو گاندھی کے اس بیان پر ہندستان کے کچھ فرقہ پرستوں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا تھا دہلی کے انگریزی ہفت روزہ آرگنائزر (۱۹ جون ۱۹۸۸) نے لکھا تھا کہ راجیو گاندھی اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایسا کہہ رہے ہیں۔ ورنہ محمد بن قاسم ہندستان میں اسلام کی اشاعت کے لئے نہیں آیا۔ وہ قتل اور لوٹ اور زناکاری کے لئے یہاں آیا تھا (صفحہ ۱۶) یہی بات ہندو مہاسبھا کے

صدر جینت پاٹل نے اپنے ایک مراسلہ میں کہی جو ٹائمس آف انڈیا (۲۰ جون ۱۹۸۸) میں چھپا تھا۔

مسٹر جینت پاٹل نے اپنے دعوے کی تائید میں مورخ بلاذری کا حوالہ دیا تھا۔ مگر یہ حوالہ سراسر غلط ہے۔ احمد بن یحییٰ البلاذری (م ۸۹۲ء) کی کتاب فتوح البلدان میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔ بلکہ اس کتاب میں محمد بن القاسم کی تصویر اس سے یکسر مختلف نظر آتی ہے جو مذکورہ مضامین میں اس کی بتائی گئی تھی۔

عربوں نے سندھ کو آٹھویں صدی عیسوی (۷۱۲ء) میں فتح کیا تھا۔ اور البلاذری کا زمانہ نویں صدی عیسوی ہے۔ اس طرح وہ ایک قریب العہد مورخ ہے۔ البلاذری نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں ایک بات یہ ہے کہ دمشق میں اندرونی سازشوں کی وجہ سے نوجوان محمد بن القاسم کو دمشق واپس بلا لیا گیا جہاں اس کو قید کر دیا گیا۔ تاہم سندھ میں وہ نہایت نیک نام تھا۔ چنانچہ سندھ کے مقامی باشندوں کے ردعمل کا ذکر کرتے ہوئے البلاذری نے لکھا ہے کہ ان کو جب اس کی خبر ملی تو ہندستان کے لوگ روئے اور انھوں نے کیرج کے مقام پر محمد بن القاسم کا بت بنایا (فبکی اھل الھند وصوروہ بالکیرج، صفحہ ۴۳۶)

محمد بن القاسم کا کردار اگر وہ ہوتا جو ہندو مہاسبھا کے صدر یا آرگنائزر کے مضمون نگار بتا رہے ہیں تو یہ ناممکن تھا کہ اہل سندھ کے درمیان اس کو یہ محبوبیت اور مقبولیت حاصل ہو کہ وہ اس کے سندھ سے جانے کے بعد اس کا ماتم کریں، حتی کہ اس کا بت بنائیں اور اس کے سامنے غیر معمولی عقیدت واحترام کا اظہار کریں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ - ۱۹۷۹) نے ۱۹۵۹ کے آخر میں بعض عرب ممالک کا دورہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں وہ شام (دمشق) میں بھی چند دن ٹھہرے۔ اس سفر کی روداد مولانا موصوف کے رفیق سفر مولانا محمد عاصم صاحب نے مرتب کی ہے جو "سفرنامہ ارض القرآن" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے:

"مولانا ان کے سوالات کا اطمینان اور تفصیل سے جواب دیتے رہے۔ ہندستان کے مسلمانوں کے متعلق مولانا نے بتایا کہ ان کی حالت ویسی ہی ہے جیسے اسرائیل میں عربوں کی۔ یہ مختصر جواب نہایت موثر رہا۔ اس مثال کے بغیر اگر ہندستان میں مسلمانوں کی حالت کے متعلق کوئی مفصل تقریر بھی کی جاتی

توشاید وہ اتنی موثر نہ ہوتی" صفحہ ۳۳

سید ابو الاعلیٰ مودودی کا یہ جواب غیر ذمہ دارانہ حد تک غلط ہے۔ مزید غیر ذمہ داری کی بات مولانا موصوف کے رفیق کا یہ جملہ ہے کہ "یہ جواب نہایت موثر رہا" گویا مسئلہ سنجیدہ حقیقت بیانی کا نہیں بلکہ مجلسی اثر آفرینی کا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات۔

جواب کے اس انداز کو میں حد درجہ غیر اسلامی اور غیر اخلاقی سمجھتا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ ہندستان کے مسلمانوں کو بعض مسائل درپیش ہیں۔ مگر وہ کون ملک ہے جہاں کسی نہ کسی قسم کے مسائل درپیش نہ ہوں۔ پھر ہندستان ہی کو ان مسائل کے لئے مطعون کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔

مارچ ۱۹۸۴ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں ایک عرب ملک میں تھا۔ ایک عرب شیخ نے اپنے مکان پر دعوت کا اہتمام کیا۔ بہت سے لوگ مدعو تھے۔ یہاں میری ملاقات ہندستان کے ایک اسلام پسند رہنما سے ہوئی۔ ایک عرب شیخ سے گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ہندستان میں تو مسلمانوں کو مسجد کے اندر بھی سجدہ کرنے کی اجازت نہیں۔

میں نے آہستہ سے پوچھا: حضرت، آپ کس ہندستان کی بات کر رہے ہیں۔ وہی ہندستان جہاں میں رہتا ہوں یا کوئی اور۔ انھوں نے فوراً صفدر جنگ (دہلی) کی مسجد کا نام لیا۔ میں نے کہا، پھر مطلق انداز میں ممانعتِ سجدہ کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو کہنا چاہئے کہ ہندستان میں لاکھوں مسجدیں ہیں جن میں مسلمانوں کو نماز کی آزادی ہے۔ البتہ ایک مسجد (صفدر جنگ) میں انھیں یہ آزادی حاصل نہیں جو بہت پہلے سے آثار قدیمہ کے ماتحت ہے۔

دمشق سے جہاز پر ۱۸۰ مسافر سوار ہوئے۔ یہ سب "زیارت" کے لوگ تھے۔ وہ پاکستان سے دمشق اور بغداد برائے زیارت گئے۔ وہاں حضرت زینب، حضرت حسین وغیرہ کے مزارات ہیں۔ اب وہ پاکستان واپس جا رہے تھے۔

میرے پاس کی سیٹ پر ایک صاحب آکر بیٹھ گئے۔ ان کا نام محمد عباس کاظمی تھا۔ وہ لاہور میں کتابوں کی دکان کرتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ وہ دہلی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ میں وہ لاہور چلے آئے۔ ان کے بال سفید ہو چکے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے دونوں زمانوں کو دیکھا ہے۔ یہ بتائیے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے والی زندگی میں اور موجودہ پاکستان کی زندگی میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے

دردمندانہ لہجہ میں کہا کہ بس یہ فرق ہے کہ پہلے ملک میں ہندو مسلم جھگڑے ہوا کرتے تھے، اب ہمارے یہاں شیعہ سنی جھگڑے ہوتے ہیں۔

"زیارت" سے لوٹنے والے یہ تمام لوگ شیعہ تھے۔ ان میں زیادہ تر عورتیں تھیں۔ میں نے محمد عباس کاظمی صاحب سے پوچھا کہ اس سفر میں فی کس کتنا خرچ آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فی کس ۱۶ ہزار روپیہ۔ ۱۸۰ آدمی ہمارے جہاز میں دمشق سے سوار ہوئے۔ مگر اس سے زیادہ تعداد ابھی دمشق اور بغداد میں موجود تھی۔ یہ لوگ جہاز کے اندر بار بار نعرہ لگا رہے تھے ـــــ نعرۂ تکبیر، نعرۂ رسالت، نعرۂ حیدری۔ نعرہ دینے والا پہلے دونوں الفاظ نسبتاً دھیرے بولتا تھا۔ مگر جب وہ "نعرۂ حیدری" بولتا تو اس کی آواز غیر معمولی طور پر تیز ہو جاتی۔

جہاز کے اندر پی آئی اے کی فلائٹ میگزین "مسافر" ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۹ مطالعہ کے لئے موجود تھی۔ اس کے انگریزی حصہ میں پی آئی اے کے بارہ میں ایک مضمون تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پی آئی اے ۱۹۵۴ میں قائم ہوئی۔ اس دوران اس نے کیا ترقی کی اور آئندہ اس کے کیا منصوبے ہیں، اس ذیل میں یہ فقرہ درج تھا کہ جمہوریت کے احیاء کی وجہ سے ملک مسکراہٹوں سے بھرا ہوا ہے اور پی آئی اے بھی ترقیاتی پرواز کے لئے اپنے بازو پھیلا رہی ہے:

> Since the revival of democracy, the country is full of smiles, and PIA too is flexing its wings (p. 29).

دوسری طرف جہاز کے اندر اردو اخبارات تھے۔ ان میں اپوزیشن لیڈروں کے بیانات ملک کے بارہ میں اس سے مختلف کہانی سنا رہے تھے ـــــ موجودہ دنیا میں کوئی زندگی کبھی آئیڈیل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص زندگی کو مثبت رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو زندگی امکانات سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ دوسرا شخص اس کو منفی رخ سے دیکھتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ زندگی مصائب اور مشکلات کے سوا اور کچھ نہیں۔

۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی صبح کو کراچی پہنچا۔ میں نے دہلی سے یہاں کا ویزا لے لیا تھا۔ چنانچہ کراچی میں ۱۲ گھنٹے قیام رہا۔ کراچی میں میرا قیام "فضلی سنز لمیٹڈ" کے یہاں تھا۔ وہ لوگ گلشن اقبال (123-D) میں رہتے ہیں۔

جہاز سے اتر کر ایرپورٹ کی بس پر سوار ہوا تو ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ بس میں زیادہ تر مسافر پاکستان (کراچی) کے تھے۔ زیادہ عمر کے ایک بزرگ اندر داخل ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ایک شخص نے ان کو دیکھ لیا اور اپنی طرف بلاتے ہوئے کہا کہ آئیے، یہاں بیٹھ جائیے۔ وہ بدستور کھڑے رہے اور کہا: میاں، بیٹھنے کا وقت کہاں، اب تو لیٹنے کا وقت ہے۔

ان کی زبان سے یہ فقرہ سن کر دل تڑپ اٹھا۔ مجھے اپنا معاملہ یاد آ گیا۔ میری عمر اب ۶۵ سال ہو چکی ہے۔ بڑھاپا اپنی تمام علامتوں کے ساتھ آنا شروع ہو گیا ہے۔ اب وہ وقت قریب آ گیا ہے جب کہ دنیا کی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے مجھے قبر کے تختہ پر لٹا دیا جائے۔

یہ دن ہر شخص کے لئے مقدر ہے۔ ہر شخص کے ساتھ ایسا ہونے والا ہے کہ اس کی موت آ جائے۔ اس کو "اپنی دنیا" سے نکال کر "خدا کی دنیا" میں داخل کر دیا جائے۔ کتنا سنگین لمحہ ہر شخص پر آنے والا ہے۔ مگر ہر شخص کتنا زیادہ اس سے غافل پڑا ہوا ہے۔

ڈاکٹر خالد انعام اللہ صاحب بھی اسی جہاز سے اترے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اکثر سفر میں رہتے ہیں اور بے شمار کانفرنسوں میں شرکت کی ہے۔ ان کے ساتھ ان کے محترم والد ڈاکٹر انعام اللہ خاں (۷۵ سال) کے مکان پر آیا۔ یہاں تقریباً آدھ گھنٹہ قیام رہا۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب موتمر العالم الاسلامی کے سکرٹری جنرل ہیں۔ اس کو مولانا محمد علی وغیرہ نے قائم کیا تھا۔ ۱۹۲۴ میں جب خلافت تحریک سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئی تو مولانا محمد علی وغیرہ کے سامنے سوال آیا کہ "اب کیا"۔ حکومتی سطح پر خلافت کا نظام قائم کرنے کے مواقع نہیں تھے، چنانچہ انھوں نے "ادارہ" کی سطح پر اس کام کو جاری رکھنے کے لئے ۱۹۲۶ میں مذکورہ موتمر قائم کی۔ اس کے پہلے صدر مفتی اعظم فلسطین اور نائب صدر علامہ اقبال تھے۔

ڈاکٹر انعام اللہ خاں صاحب نے اپنے والد حاجی عبد الکریم خاں غازیپوری (وفات ۱۹۷۴) کے بارہ میں بتایا کہ وہ نہایت نیک نفس آدمی تھے۔ اپنے ملازموں کو جاہل دیکھنا انھیں گوارا نہ تھا۔ چنانچہ وہ خود انھیں پڑھایا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ لوگوں کو کھلانے پلانے میں کوتاہی نہ کرو، اور جو کچھ تمہارے گھر میں موجود ہے بس وہی پیش کر دو، کیوں کہ جو تمہارے کھانے کے قابل ہے، وہ تمہارے مہمان کے کھانے کے قابل بھی ہے۔

حافظ عبد الکریم صاحب کا ایک خاص نظریہ تھا جس کو وہ "تطہیر فکر اول" کے لفظوں میں بیان کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ عمل ہمیشہ فکر کے تحت ہوتا ہے۔ فکر اگر صحیح نہ ہوگا تو عمل بھی صحیح نہ ہوگا۔ میں نے کہا کہ یہی جڑ کی بات ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہماری تمام تحریکیں ناکام ہو گئیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ ان کے رہنماؤں نے تطہیر فکر کا اول کام کئے بغیر عملی اقدام کے ثانوی کام سے اپنے سفر کا آغاز کرنا چاہا۔ ایسی تحریک کے لئے موجودہ اسباب کی دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں ـــــ خلافت تحریک کی ناکامی کا سبب بھی یہی ہے۔

" پاکستان ابھی تک پاکستان نہ بن سکا" ایک "اسلام پسند" پاکستانی نے کہا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان اس لئے بنا تھا کہ وہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے، مگر ابھی تک پاکستان میں اسلامی نظام قائم نہ کیا جا سکا۔ اگر آپ پاکستان جائیں یا پاکستان کے اخبارات پڑھیں تو یہ بات آپ کو بے شمار لوگوں کی زبان سے سنائی دے گی۔

وہ کون ہے جس نے نصف صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک پاکستان کو پاکستان بننے نہیں دیا۔ اس کے جواب میں لوگ مختلف طاقتوں یا شخصیتوں کا نام لیں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس المیہ کے سب سے بڑے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے وجود میں آتے ہی " مطالبہ نظام اسلامی" کا جھنڈا لے کر کھڑے ہو گئے۔

۱۹۴۷ میں جو چیز وجود میں آئی وہ صرف ایک جغرافی خطہ تھا۔ اس جغرافی خطہ میں وہ مسلم معاشرہ موجود نہ تھا جو اسلامی نظام کے قیام کا تحمل کر سکے۔ یہاں " اسلام پسند" لوگوں کو صرف یہ کرنا تھا کہ وہ افراد کی ایمانی بیداری اور معاشرہ کی دینی اور اخلاقی اصلاح میں لگ جاتے۔ سیاست کو وہ کچھ عرصہ کے لئے اپنے حال پر چھوڑ دیتے۔ یعنی الکشن میں جو لوگ ووٹوں کی اکثریت حاصل کرتے انھیں موقع دیا جاتا کہ وہ حکومت کریں۔ ایک طرف انفرادی سطح پر اصلاح کا عمل چلتا رہتا اور دوسری طرف الکشن پروسس اپنی فطری رفتار سے جاری رہتا۔ اگر ایسا کیا گیا ہوتا تو اب تک یقینی طور پر وہ منزل آجاتی جو مطالباتی اسلام کے نتیجہ میں مزید دور ہوتی ہوئی نظر آرہی ہے۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر اور پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ وہ بحر

عرب کے کنارہ واقع ہے۔ ۱۸ویں صدی کے آغاز میں کراچی صرف ایک معمولی گاؤں تھا۔ یہاں زیادہ تر مچھیرے رہتے تھے۔ ۱۸۳۹ میں انگریزوں نے اس پر قبضہ کیا۔ یہ قبضہ بے حد اہم تھا۔ یہ واقعہ آخری مغل حکمراں بہادر شاہ ثانی کے زمانہ حکومت (۱۸۵۷ - ۱۸۳۷) میں ہوا۔ اس وقت ہندستان میں بہت سے علما، اور مسلمین موجود تھے۔ مگر مطبوعہ ریکارڈ سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان میں سے کوئی شخص "کراچی" کی اہمیت کو جانتا ہو۔ کراچی کی اہمیت کو جاننے کے لئے سمندری شعور درکار تھا، اور اس وقت مسلم زعماء میں سے ہر ایک صرف "سیاسی طاقت" کو جانتا تھا، ان میں سے کسی کو "سمندری طاقت" کی خبر نہ تھی۔ بدقسمتی سے یہی صورت حال ظاہری فرق کے ساتھ آج بھی باقی ہے۔

انگریزوں نے کراچی پر قبضہ کرکے وہاں اپنی فوجیں رکھ دیں۔ ۱۸۴۳ میں انھوں نے کراچی اور ملتان کے درمیان دریائے سندھ کے راستہ سے پہلی اسٹیمر سروس شروع کی۔ اب کراچی بندرگاہ کی حیثیت سے ترقی کرنے لگا۔ ۱۸۶۴ میں کراچی سے لندن کے لئے براہ راست ٹیلی گراف کا نظام قائم کیا گیا۔ ۱۸۶۹ میں نہر سوئز کھلنے کے بعد کراچی کی اہمیت مزید بڑھ گئی۔ ۱۸۷۳ تک کراچی ایک مکمل بندرگاہ بن چکا تھا۔ ۱۸۷۸ میں یہاں ریلوے لائن بچھائی گئی۔ ۱۹۱۴ میں کراچی پوری برطانی شہنشاہیت میں گیہوں برآمد کرنے کا سب سے بڑا مرکز بن گیا۔ ۱۹۲۴ میں یہاں ایک ہوائی اڈہ بنایا گیا جو اب توسیع کے بعد انٹرنیشنل ایرپورٹ کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۹ تک وہ پاکستان کی پہلی راجدھانی تھا۔

سندھ میں توڑ پھوڑ کی سیاست لا متناہی طور پر جاری ہے۔ اس سیاست کے نتیجہ میں کچھ لیڈروں کو شہرت اور مقبولیت مل رہی ہے۔ مگر خود سندھ اور اس کے عوام تیزی سے بدحالی کی طرف جا رہے ہیں۔ اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ تاجر طبقہ (ملکی اور غیر ملکی دونوں) سندھ میں اپنا کاروبار سمیٹ رہا ہے اور پنجاب کی طرف اپنا رخ کرنے لگا ہے۔ آج ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کے اخبار جنگ میں ایک اڈیٹوریل نوٹ (سندھ سے سرمایہ کاروں کی نقل مکانی) نظر سے گزرا۔ اس کے تحت درج تھا:

" ایک اخباری اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ سندھ میں ڈکیتی اور اغوا کے واقعات میں اضافے

کے بعد وہاں کے بالخصوص کراچی کے سرمایہ کاروں نے پنجاب کی طرف نقل مکانی شروع کردی ہے اور اب سندھ کے بجائے پنجاب میں نئے صنعتی یونٹ لگانے کے لئے قومی بینکوں اور مالیاتی اداروں سے رجوع کرنے کا آغاز کر دیا ہے اور پنجاب کے بڑے شہروں کے قرب وجوار میں اپنے عزیز و اقارب کے توسط سے صنعتی یونٹ لگانے اور دیگر کاروبار کرنے کے لئے آراضی کی خرید میں مصروف ہیں۔ سرمائے کی گردش اور سرمایہ کاری صرف پر امن فضا ہی میں ممکن ہوتی ہے اور سرمائے کی منڈی اتنی حساس ہوتی ہے کہ محض ایک افواہ ہی اس کے کونے کونے تک اتھل پتھل مچا کر رکھ دیتی ہے۔ صوبہ سندھ میں ایک عرصے سے اغوا و ڈکیتیوں کے جو واقعات رونما ہوئے ہیں وہ یقیناً سرمایہ کاری کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے ہیں اور اس بات کا امکان ہے کہ اس سے سرمایہ کاروں میں نقل مکانی کا رجحان پیدا ہوا ہو۔"

ایک پاکستانی مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ وہ خلیج کے ایک ملک میں کچھ دنوں رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز وہ وہاں کے پوسٹ آفس میں ایک خط کی رجسٹری کرنے گئے۔ لفافہ پر انھوں نے ہندستانی قاعدہ کے مطابق، بھیجنے والے کا پتہ لفافہ کے نیچے بائیں طرف لکھا تھا۔ جب کہ خلیجی قاعدہ کے مطابق، اس پتہ کو لفافہ کے اوپر بائیں طرف لکھا جانا چاہئے۔

پوسٹ آفس کے عرب کلرک نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ غلط ہے، دوسرے لفافہ پر صحیح پتہ لکھ کر لاؤ۔ آدمی نے کہا کہ میرے پاس دوسرا لفافہ نہیں، اور اس وقت بازار سے بھی دوسرا لفافہ حاصل کرنا مشکل ہے، آپ اسی لفافہ کو قبول کرلیں۔ بات بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ کلرک نے بگڑ کر کہا: اتخالف النظام (کیا تم نظام کی خلاف ورزی کرنا چاہتے ہو) یہ جملہ وہاں کے لحاظ سے ایک قسم کی دھمکی تھی۔ اس کا مطلب، دوسرے لفظوں میں یہ تھا کہ خاموش رہو، ورنہ تم کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے گا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خلیجی ممالک میں کتنا سخت گیری کا ماحول ہے۔ خلیجی ممالک میں جو امن ہے، وہ دراصل اسی پابند نظام کا نتیجہ ہے، اور ہندستان میں جو بے امنی ہے، وہ یہاں کے آزاد نظام کا نتیجہ۔ اس دنیا میں اکثر اوقات یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی بیک وقت دونوں چیزوں کو پا سکے۔ ایک کو لینے کے لئے اسے دوسرے کو چھوڑنا

پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا کہ ہندستان نے تقسیم کو دل سے قبول نہیں کیا، اس لئے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہیں اور دونوں جگہ ترقی کا عمل رکا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ توعین وہی نفسیات ہے جس میں خود پاکستان کے لوگ بہت بڑے پیمانے پر مبتلا ہیں۔ یہاں جب بھی الکشن ہوتا ہے اور کچھ لوگ جیت کر اوپر آتے ہیں تو ہارنے والے لوگ ان کی جیت کو قبول نہیں کرتے۔ وہ فوراً فاتح کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دیتے ہیں۔ تخریب کاری کی اس سیاست میں اسلام پسند لوگ بھی پوری طرح شریک ہیں۔ اس کے نتیجہ میں پاکستان کے ماحول میں منفی ذہنیت اور تخریبی مزاج اتنا زیادہ بڑھ گیا ہے کہ اب اس کے ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ "تم جیتے، میں ہارا" ایک سادہ سا جملہ ہے، مگر پاکستان کے بے ریش اور باریش رہنماؤں میں کوئی بھی شخص اب تک اس جملہ کو کہنے کی جرأت نہ کرسکا۔

کراچی کے ہفت روزہ تکبیر (۴ ستمبر ۱۹۸۹) میں ایک پورے صفحہ پر نمایاں انداز میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ یہ "ایک خادم ملت" کی طرف سے ہے اور اس کے اوپر قرآن کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ یہ مضمون ایک آیت کے ترجمہ اور اس کے عنوان پر مشتمل ہے جو اس طرح ہے:

هرگز نہ دبو ایسے شخص سے

ہرگز نہ دبو کسی ایسے شخص سے جو بہت قسمیں کھانے والا بے وقعت آدمی ہے۔ طعنے دیتا ہے۔ چغلیاں کھاتا پھرتا ہے۔ بھلائی سے روکتا ہے۔ ظلم و زیادتی میں حد سے گزرنے والا ہے۔ سخت بد اعمال ہے۔ جفاکار ہے اور ان سب عیوب کے ساتھ بد اصل ہے۔ (القلم ۱۰-۱۶)

ولا تطع کا ترجمہ "ہرگز نہ دبو" اور اس کے اوپر مذکورہ جلی سرخی سے بظاہر یہ تاثر ہوتا ہے کہ یہ آیت ایسے لوگوں سے لڑائی لڑنے کا حکم دے رہی ہے۔ حالانکہ آیت کا یہ مفہوم نہیں۔ اسی قسم کے ترجموں اور تفسیروں نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا یہ مزاج بنا دیا ہے کہ ہر جگہ وہ لڑنے بھڑنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ حکمت اور ہم آہنگی کو انھوں نے بزدلی سمجھ لیا ہے اور نزاع اور تصادم کو جہاد۔

اس آیت میں " اطاعت نہ کرو " کا مطلب یہ ہے کہ ان کا اثر نہ لو ۔ ان کی باتوں پر دھیان نہ دو ۔ ان کی رعایت کرتے ہوئے اپنی دعوت کے انداز میں تبدیلی نہ کرو ۔ یہاں " اطاعت " کا لفظ اسی مفہوم میں شدت پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ یہ بتانے کے لئے کہ ان سے " ہرگز نہ دبو " اس عسکری مفہوم کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ۔

ایک مسلم نوجوان جو کالج میں پڑھ رہے ہیں ، ان سے میں نے یہاں کے تعلیمی اداروں کے حالات پوچھے ۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں اسکولوں اور کالجوں میں سیاست بازی اور دہشت گردی اتنی عام ہوگئی ہے کہ وہاں اب پڑھنے کا ماحول باقی نہیں رہا ۔ مزید یہ کہ یہاں مہلک ہتھیار (کلاشنکوف ، پستول) بالکل عام ہیں ۔ کسی بھی وقت ایک شخص آکر ایک طالب علم کو گولی کا نشانہ بنا کر بھاگ جائے گا اور اس کا کچھ نہیں ہوگا ۔

انھوں نے بتایا کہ اس صورت حال کی بنا پر اب یہ حال ہے کہ جو لڑکے واقعی پڑھنا چاہتے ہیں ، وہ امریکہ چلے جاتے ہیں ۔ اور جب وہ امریکہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں تو اس کے بعد وہ وہیں رہ جاتے ہیں ۔ دوبارہ وہ پاکستان واپس نہیں آتے ۔ میں نے کہا کہ یہ تمام نقصانوں میں سب سے بڑا نقصان ہے ۔ جو نوجوان مجبوراً یہاں ٹھہریں وہ اچھی تعلیم حاصل نہ کر سکیں گے اور جن کے پاس وسائل ہوں یا جو زیادہ ہونہار ہوں وہ باہر چلے جائیں گے ۔ اکبر الٰہ آبادی نے انگریزوں کے جاری کردہ نظام تعلیم پر طنز کرتے ہوئے کہا تھا :

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا   افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اکبر الٰہ آبادی اور ان کے جیسے دوسرے رہنماؤں کو معلوم نہ تھا کہ اصل مسئلہ قوم کی بے شعوری ہے نہ کہ انگریزوں کا تعلیمی نظام ۔ اس بے شعوری کی حالت میں " انگریز " کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ ان کے ملک میں آکر ان کے نوجوانوں کو " قتل " کرے ۔ وقت کا فرعون اپنے ملک میں رہے گا اور ہماری قوم کے نوجوان خود بھاگ بھاگ کر اس کے یہاں پہنچیں گے اور اس کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دیں گے تاکہ وہ انھیں قتل کر سکے ۔

ایک صاحب جو الرسالہ پڑھتے ہیں ، انھوں نے راقم الحروف کے انداز پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کا انداز پرو گورنمنٹ (pro-government) انداز ہے ۔ میں نے

کہا کہ یوں نہ کہئے۔ بلکہ اس طرح کہئے کہ آپ کا انداز پرو ریلیٹی (pro-reality) انداز ہے۔ میرا کسی حکومت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف یہ کرتا ہوں کہ میں حقیقت پسندی کی بات کرتا ہوں۔ مگر لوگوں کے منفی ذہن کی وجہ سے وہ انھیں حکومت پسندی کی بات معلوم ہوتی ہے۔

الرسالہ میں ایک بار ہندستان اور پاکستان کی جنگ کا ذکر تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ اس جنگ میں پاکستان کامیاب نہ ہو سکا، اور اس کی وجہ اس کی کمتر تیاری تھی۔ اس کے مقابلہ میں ہندستانی فوج نے زیادہ بہتر منصوبہ بندی کا ثبوت دیا، اس لئے وہ پاکستان کی پیش قدمی کو روک دینے میں کامیاب رہے۔ یہ تذکرہ صرف بطور سبق تھا۔ مگر الرسالہ کے بہت سے پاکستانی خریدار اس پر سخت ناراض ہوئے حتی کہ انھوں نے الرسالہ کو پڑھنا بند کر دیا۔

یہاں اخبار نوائے وقت ۵ ۲ ستمبر ۱۹۸۹ میں ایک مضمون (اصل حقائق) پڑھنے کو ملا۔ یہ اخبار بیک وقت لاہور، راولپنڈی، ملتان، کراچی سے شائع ہوتا ہے۔ ایک سابق فوجی افسر ابوذر غفاری نے جو کچھ لکھا تھا، اس کا ایک حصہ عبرت کے طور پر یہاں نقل کیا جاتا ہے:

"پاک فوج کے چیف آف دی آرمی سٹاف جنرل مرزا محمد اسلم بیگ نے ۱۲ ستمبر ۱۹۸۹ کو جی ایچ کیو آڈیٹوریم میں ملک بھر کے ایڈیٹروں اور سینئر صحافیوں کے سوالوں کے جوابات دئے تھے۔ انھوں نے جب یہ کہا کہ ۱۹۶۵ کی جنگ ہم نے نہ جیتی نہ ہاری اور یہ کہ ۱۹۷۱ کی جنگ ہم ہار گئے تو اس نے ہر فوجی کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہوگا کہ وہ ان دونوں جنگوں کا دوبارہ جائزہ لیں۔

جنرل صاحب کا یہ کہنا حقائق کے عین مطابق ہے کہ ۱۹۶۵ کی جنگ ہم نے نہیں جیتی تھی اور نہ ہی ہم اسے ہارے تھے۔ ۱۶ ستمبر تک پاکستان اور بھارت دونوں یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان میں سے کوئی بھی اس جنگ کو نہیں جیت سکتا۔ اسی لئے دونوں کی یہ کوشش تھی کہ کوئی اس جنگ کو بند کر وادے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جنگ بچوں کا کھیل نہیں۔ جنگ لڑنے کے لئے امن کے زمانے میں بہت زیادہ تیاری کرنا پڑتی ہے۔ تیزی سے ختم ہوتے ہوئے گولہ بارود کے ذخائر اور فوجی ساز و سامان کی توڑ پھوڑ نے دونوں ممالک کے جرنیلوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بہتر یہی ہوگا کہ جنگ جلد از جلد بند کر دی جائے۔ اسی لئے جب سلامتی کونسل نے جنگ بندی کے لئے کہا تو دونوں ممالک نے اسے تسلیم کر لیا۔

بدقسمتی سے سیاست دانوں کو اپنے عوام کو ساتھ رکھنے کے لئے قدم قدم پر جھوٹ بولنا پڑتا ہے اسی پاکستان کے حکمرانوں نے یہ اعلان کیا کہ انھوں نے بھارت کی کئی گنا افواج کو شکست دے دی ہے اس طرح پاکستان کے عوام نے یہ یقین کرلیا کہ انھوں نے یہ جنگ جیت لی ہے۔ شاعروں ادیبوں اور گانے والوں نے پاک افواج کے بہت گن گائے۔

سیاست دانوں نے نہ صرف عام لوگوں کو گمراہ کیا تھا بلکہ فوج بھی یہ سمجھنے لگی کہ اس نے بھارتی فوج کو شکست دے دی ہے۔ فوجی تقریبات میں گانے والوں کو بلایا گیا جنھوں نے "میرا ماہی چھیل چھبیلا" "کرنیل نی جرنیل نی" جیسے گانے گائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فوجی خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے۔ یہ صورت حال حساس فوجی افسروں کے لئے بہت تکلیف دہ تھی۔ اس جنگ کے چند ہفتوں بعد جب جنرل موسی خاں سیالکوٹ تشریف لائے اور انھوں نے وہاں دو ڈویژنوں کے افسروں سے خطاب کرتے ہوئے اس جنگ پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تو میں نے ان سے سب کے سامنے جب دوران جنگ ہونے والی چند غلطیوں کا ذکر کیا تو ہر طرف سے شور اٹھا کہ بیٹھ جاؤ۔ میری تنقید تعمیری تھی۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے سوچیں تاکہ ہم اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرسکیں۔ لیکن میں ابھی اس وقت اتنا باہوش نہیں تھا کہ یہ سمجھتا کہ انسان اپنی غلطی کو تسلیم کرنے کے لئے نہیں ہوتا۔ اور وہ اپنی غلط بات پر اصرار کرتا رہتا ہے۔"

کراچی کی سڑکوں سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ "یوم شہدا" کا بورڈ نظر آیا۔ آج ۳۰ ستمبر کے اخبارات (مثلاً حریت ۳۰، ستمبر ۱۹۸۹) کے صفحہ اول پر اس قسم کی سرخیاں تھیں: آج پورے سندھ میں یوم شہدا حیدرآباد منایا جارہا ہے۔" اسی کے ساتھ آج ہی کے اخبار (نوائے وقت ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر جلی سرخی تھی کہ" اتر پردیش اور مقبوضہ کشمیر میں ۴۲ مسلمان شہید کردئے گئے۔ مسلمان ہندستان میں بھی "شہید" ہورہے ہیں اور پاکستان میں بھی۔

کراچی کے اخبار حریت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) اور اسی تاریخ کے وفاق اور نوائے وقت میں جو خبریں پڑھیں، ان کا خلاصہ یہ تھا کہ" ۳۰ ستمبر کو مہاجر قومی موومنٹ کے زیر اہتمام پورے سندھ میں یوم شہدا حیدرآباد منایا گیا۔ پچھلے سال ۳۰ ستمبر ۱۹۸۸ کو یہ واقعہ ہوا تھا کہ مسلح دہشت گرد (پٹھانوں) نے کلاشنکوف اور دیگر جدید خودکار ہتھیاروں سے اندھا دھند فائرنگ کرکے

حیدرآباد (سندھ) میں دو سو سے زیادہ (مہاجر) شہریوں کو شہید کر دیا تھا۔ ان میں بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے سب شامل تھے۔ ان شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مہاجر قومی موومنٹ نے شہیدوں کی پہلی برسی کے موقع پر یوم شہدا حیدرآباد منانے کا اعلان کیا ہے۔ دیگر کارروائیوں کے علاوہ پورے حیدرآباد میں جگہ جگہ سیاہ بینر آویزاں کئے گئے جن پر ۳۰ ستمبر کے شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی یہ انوکھی خوش قسمتی ہے کہ وہ اگر غیر مسلموں کی گولی سے مارے جائیں تب بھی وہ شہید ہوتے ہیں، اور اگر وہ آپس میں لڑ کر مریں تب بھی شہید ہوتے ہیں۔ خوش قسمتی کی یہ قسم اس سے پہلے کسی دور کے مسلمانوں کے حصہ میں نہیں آئی۔

نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) سے معلوم ہوا کہ پاکستان میں ایک طرف جئے سندھ کے نعرے ہیں، اور دوسری طرف جئے مہاجر کے نعرے۔ صفحہ اول پر مہاجر تحریک کے لیڈر الطاف حسین کی تقریر کی رپورٹ تھی۔ اس کے چند جملے یہ ہیں: ایم کیو ایم کے ارکان قومی اسمبلی نے جس طرح ایوان میں مہاجروں کے حقوق کے لئے آواز بلند کی ہے، اس کی مثال ۴۲ سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے کہا کہ مہاجروں میں جوش و جذبہ برقرار رہا تو مہاجروں کو سمندر میں دھکیلنے کا دعویٰ کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ کسی کو حق نہیں کہ وہ یہ کہنا شروع کر دے کہ جو سندھی نہیں ہے، وہ سندھ سے چلا جائے۔ ہم نے سندھی بن کر رہنے کے لئے نہیں، بلکہ پاکستانی بن کر رہنے کے لئے پاکستان بنایا تھا"۔

الفاظ میں معمولی تبدیلی کر دیجئے تو ہندستان کا مسلمان لیڈر بھی عین یہی تقریر کر رہا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کا "مسئلہ" ہندو ظلم" کا مسئلہ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ٹھیک یہی واقعہ پاکستان میں کیوں پیش آتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ بے دانشی کا مسئلہ ہے۔ مسلمان (یا صحیح تر لفظوں میں ان کے رہنما) دانش کو کھو بیٹھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک ہی قسم کے مسائل سے دونوں جگہ دوچار ہیں، ہندستان میں بھی اور پاکستان میں بھی۔

اخبار نوائے وقت (۳۰ ستمبر ۱۹۸۹) میں صفحہ اول پر ایک خبر تھی۔ جماعت اسلامی پاکستان کے موجودہ امیر قاضی حسین احمد صاحب نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی

مسلمان امت کو ایک سازش کے تحت پچاس قوموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ اس وقت اولین ضرورت اس امر کی ہے کہ زبان، علاقہ، برادری، فرقوں میں منتشر اس امت کو مجتمع کر کے ایک قوت بنایا جائے" اسی طرح جماعت اسلامی کے دوسرے رہنماؤں، چودھری رحمت الٰہی اور پروفیسر غفور احمد نے پاکستان کے موجودہ حالات کی نہایت تاریک تصویر پیش کی۔

میں نے جماعت اسلامی کے ایک صاحب سے کہا کہ آپ لوگ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو عہد ساز شخصیت کہتے ہیں، پھر جو عہد انھوں نے بنایا ہے، وہ کہاں ہے۔ وہ نہ ہندستان میں نظر آتا اور نہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں۔ نہ کسی دوسرے چھوٹے یا بڑے مقام پر۔ اگر آپ کسی ایسے مقام کا پتہ بتائیں جہاں یہ عہد سازی ہوئی ہے تو میں وہاں پہنچ کر اس کو دیکھوں گا۔ مگر وہ کسی ایسے مقام کا نام نہ لے سکے۔

قدیم زمانہ کے لوگ اپنے بادشاہوں کی تعریف میں مبالغہ آمیز اشعار کہا کرتے تھے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے مفروضہ اکابر کی شان میں اسی قسم کی شاعرانہ لفاظی کر رہے ہیں۔ یہ ذوق سب سے زیادہ ان دو ملکوں میں ہے جس کا نام ہندستان اور پاکستان ہے۔

پاکستانی اخبارات میں ہندستان کے فساد کی خبریں تھیں۔ ان میں اس قسم کی سرخیاں نظر پڑیں ___ بھارت میں مسلم کشی، بھارت میں مسلمانوں کا قتل عام۔ ان سرخیوں کو پڑھ کر ہندستان کے بارہ میں عجیب خونیں تصور قائم ہوا۔ شبہ ہوا کہ دہلی ایرپورٹ پر اترنے کے بعد میں زندہ گھر پہنچوں گا یا میری لاش گھر لے جائی جائے گی۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ مبالغہ اور تعمیم کی بات تھی۔ بدقسمتی سے دونوں ملکوں میں یہی غیر معتدل صورت حال قائم ہے۔ ہندستان کے اخبارات پاکستان کے بارہ میں اسی قسم کی مبالغہ آمیز خبریں شائع کرتے ہیں۔ اور پاکستان کے اخبارات ہندستان کے بارہ میں اسی طرح مبالغہ اور تعمیم کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ اس ناگوار صورت حال کو ختم کرنے کی صورت صرف ایک ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک ملک یک طرفہ طور پر اسے ختم کر دے۔ اس کے بعد دوسرے ملک میں اپنے آپ اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔

کراچی سے دہلی کا سفر پی آئی اے کے ذریعہ طے ہوا۔ اور میں ۳۰ ستمبر ۱۹۸۹ کی رات کو

دہلی پہنچا۔ میرے ساتھ سفر میں ہمیشہ صرف ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ ہوتا ہے۔ نہ مزید لگیج اور نہ کسٹم کا کوئی سامان۔ اس لئے جہاز سے اترنے کے بعد مجھے ایرپورٹ پر رکنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ میں فوراً "گرین چینل" کی طرف سے باہر آجاتا ہوں۔ آج بھی ایسا ہی پیش آیا۔

حدیث میں بتایا گیا ہے کہ جس کو دنیا میں سامان کم ملا، اس کا حساب آخرت میں بھی کم ہوگا (قلۃ المال اقل للحساب)، دل نے کہا کاش دنیا کا یہ واقعہ آخرت میں پیش آنے والے معاملہ کی علامت ہو۔ جس طرح دنیا کے ایرپورٹ نے مجھے آسانی کے ساتھ گزار دیا، اسی طرح آخرت کے "ایرپورٹ" پر بھی مجھ کو آسانی کے ساتھ گزار دیا جائے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

انسانی جہاز مجھ کو وطن سے اٹھا کر لے گیا اور افریقہ کی زمین پر اتار دیا۔ اور پھر دوبارہ وطن کی طرف واپس لایا۔ موت کا جہاز مجھ کو لے جا کر آخرت کی دنیا میں اتار دے گا جہاں سے واپسی کے لئے کوئی سواری ملنا ممکن نہیں۔ ایک سفر ختم ہوگیا، دوسرا سفر شروع ہونے والا ہے۔ پہلے سفر کی تاریخیں معلوم تھیں، دوسرے سفر کی کوئی تاریخ معلوم نہیں۔ کتنا فرق ہے ایک سفر میں اور دوسرے سفر میں۔ اسی فرق کو جاننے کا نام ایمان ہے اور اسی فرق کو نہ جاننے کا نام کفر۔

سفرنامہ بہت لمبا ہوگیا۔ مگر اس کی آخری سطریں لکھتے ہوئے مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ سراسر نا تمام ہے۔ شاید جو بات لکھنے کی تھی، وہی اس میں لکھنے سے رہ گئی۔ کوئی انسان دوسروں کی کہانی کیا لکھے گا، وہ خود اپنی کہانی بھی تحریر نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پڑھنے والے صرف وہ ہیں جو نہ لکھے کو پڑھیں۔ جاننے والے صرف وہ ہیں جو نہ بتائے ہوئے کو جانیں۔ مگر آج کی دنیا میں لکھے ہوئے کو پڑھنے والے بھی موجود نہیں۔ پھر نہ لکھے ہوئے کو پڑھنے والے اس دنیا میں کہاں ملیں گے۔ خدا اس بندے پر رحم فرمائے جو زبان رکھتے ہوئے بے زبان ہے۔ جس کے پاس قلم ہے۔ مگر جب اس نے قلم اٹھایا تو وہ صرف یہ لکھ سکا کہ میں نے لکھنا چاہا تھا، مگر میں لکھنے میں ناکام رہا۔

۱- ۲۰ دسمبر ۱۹۸۹ کو سی بی سی آئی سنٹر (نئی دہلی) میں ایک مذہبی پروگرام تھا۔ انٹرریلیجس فورم فار کمیونل ہارمونی نے کرسمس کی تقریب سے اس کو منعقد کیا تھا۔ اس موقع پر تمام مذاہب کے اعلیٰ نمائندے شریک ہوئے۔ اسلامی مرکز کو اس موقع پر اسلام کی نمائندگی کی دعوت دی گئی تھی۔ مرکز کی طرف سے ڈاکٹر ثانی اثنین خاں نے اس موقع پر پیپر پیش کیا۔ اس پیپر میں سورہ مریم (آیت ۱۶ تا ۳۶) کا انگریزی ترجمہ درج تھا۔ اس کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام کے بارہ میں اسلامی نقطۂ نظر کو مختصر طور پر بیان کیا گیا تھا۔

۲- یونیسف (UNICEF) کے زیر اہتمام نئی دہلی (انڈیا انٹرنیشنل سنٹر) میں ۲۷ دسمبر ۱۹۸۹ کو ایک سیمنار ہوا۔ اس کا موضوع نیشنل ڈولپمنٹ تھا۔ اس میں صدر اسلامی مرکز کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی۔ اس کے مطابق وہاں ایک پیپر پیش کیا گیا۔ حاضرین میں دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے۔

۳- بمبئی کے کچھ لوگوں نے ۱۰۳ لائبریریوں کی طرف سے زرتعاون ادا کر کے ۱۰۳ لائبریریوں کے نام الرسالہ جاری کروایا ہے۔ یہ ایک اچھی مثال ہے۔ اگر اسی طرح دوسرے لوگ تعاون کریں اور الرسالہ ملک کی تمام لائبریریوں میں پہونچنے لگے تو ذہنی تعمیر کا کام بہت وسیع پیمانہ پر نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ہونے لگے گا۔

۴- الرسالہ مشن کی تقریباً پندرہ سالہ جدوجہد اب اس حد تک موثر ہوئی ہے کہ عام طور پر لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل رہا ہے۔ اس کی مثالیں روزانہ سامنے آرہی ہیں۔ مثلاً دہلی کے ایک ماہنامہ ذکر و فکر (جنوری ۱۹۹۰) نے ہندستان کے فسادات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کو مسلمانوں کی داعیانہ کوتاہی سے جوڑا ہے۔ اس نے لکھا ہے: مسلمانوں کا وجود دعوت سے وابستہ ہے اور دعوت ہی ان کے تحفظ اور بقا کی ضامن ہے۔ پوری امت رسول رحمت صلے اللہ علیہ وسلم کی نائب اور قائم مقام ہے۔ کوئی ہرکارہ اپنے فرض منصبی کو ادا نہ کرسکے تو وہ ناکارہ کہا جاتا ہے "

۵- ایک عرب نوجوان محمد طارق الکردی آئرلینڈ (ڈبلن) میں مقیم ہیں۔ وہ الرسالہ مشن

ایجنسی الرسالہ

ماہنامہ الرسالہ بیک وقت اردو اور انگریزی زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اردو الرسالہ کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ذہنی تعمیر ہے۔ اور انگریزی الرسالہ کا خاص مقصد یہ ہے کہ اسلام کی بے آمیز دعوت کو عام انسانوں تک پہونچایا جائے۔ الرسالہ کے تعمیری اور دعوتی مشن کا تقاضا ہے کہ آپ نہ صرف اس کو خود پڑھیں بلکہ اس کی ایجنسی لے کر اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں دوسروں تک پہونچائیں۔ ایجنسی گویا الرسالہ کے متوقع قارئین تک اس کو مسلسل پہونچانے کا ایک بہترین درمیانی وسیلہ ہے۔

الرسالہ (اردو) کی ایجنسی لینا ملت کی ذہنی تعمیر میں حصہ لینا ہے جو آج ملت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی طرح الرسالہ (انگریزی) کی ایجنسی لینا اسلام کی عمومی دعوت کی مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنا ہے جو کار نبوت ہے اور ملت کے اوپر خدا کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔

ایجنسی کی صورتیں

۱۔ الرسالہ (اردو یا انگریزی) کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے تمام اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمے ہوتے ہیں۔ ۱۰ پرچوں سے زیادہ تعداد پر کمیشن ۳۳ فی صد ہے۔

۲۔ زیادہ تعداد والی ایجنسیوں کو ہر ماہ پرچے بذریعہ وی پی روانہ کیے جاتے ہیں۔

۳۔ کم تعداد کی ایجنسی کے لیے ادائگی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پرچے ہر ماہ سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں، اور صاحب ایجنسی ہر ماہ اس کی رقم بذریعہ منی آرڈر روانہ کر دے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چند ماہ (مثلاً تین مہینے) تک پرچے سادہ ڈاک سے بھیجے جائیں اور اس کے بعد والے مہینہ میں تمام پرچوں کی مجموعی رقم کی وی پی روانہ کی جائے۔

۴۔ صاحب استطاعت افراد کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ ایک سال یا چھ ماہ کی مجموعی رقم پیشگی روانہ کر دیں اور الرسالہ کی مطلوبہ تعداد ہر ماہ ان کو سادہ ڈاک سے یا رجسٹری سے بھیجی جاتی رہے۔ ختم مدت پر وہ دوبارہ اسی طرح پیشگی رقم بھیج دیں۔

۵۔ ہر ایجنسی کا ایک حوالہ نمبر ہوتا ہے۔ خط و کتابت یا منی آرڈر کی روانگی کے وقت یہ نمبر ضرور درج کیا جائے۔

زر تعاون الرسالہ

قیمت فی شمارہ	۵ روپیہ
زر تعاون سالانہ	۶۰ روپیہ
خصوصی تعاون سالانہ	۳۰۰ روپیہ

بیرونی ممالک کے لیے

ہوائی ڈاک (سالانہ)	۲۵ ڈالر امریکی
بحری ڈاک (سالانہ)	۱۵ ڈالر امریکی
خصوصی تعاون سالانہ	۱۰۰ ڈالر امریکی

ڈاکٹر ثانی اثنین خاں پرنٹر پبلیشر مسئول نے نائس پرنٹنگ پریس دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ سی۔ ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی سے شائع کیا

Delhi Postal Regd. No D(SE) 243 □ RNI 28822/76 □ March 1990 No 160 □ Rs. 5

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

تذکیر القرآن جلد اول	Rs 150/-
" " جلد دوم	150/-
اللہ اکبر	40/-
پیغمبر انقلاب	35/-
مذہب اور جدید چیلنج	40/-
عظمت قرآن	25/-
دین کامل	45/-
الاسلام	35/-
ظہور اسلام	35/-
اسلامی زندگی	25/-
احیاء اسلام	20/-
رازِ حیات (مجلد)	55/-
صراطِ مستقیم	35/-
خاتونِ اسلام	40/-
سوشلزم اور اسلام	35/-
اسلام اور عصر حاضر	25/-
حقیقتِ حج	30/-
اسلامی تعلیمات	25/-
اسلام دورِ جدید کا خالق	20/-
رشدیات	
تعمیر کی طرف	8/-
راہِ عمل	
تبلیغی تحریک	20/-
میوات کا سفر	30/-
اقوالِ حکمت	20/-
تعمیر کی غلطی	45/-

دین کی سیاسی تعبیر	15/-
دین کیا ہے	4/-
قرآن کا مطلوب انسان	10/-
تجدید دین	
اسلام دین فطرت	5/-
تعمیر ملت	5/-
تاریخ کا سبق	5/-
مذہب اور سائنس	
عقلیاتِ اسلام	
فسادات کا مسئلہ	4/-
انسان اپنے آپ کو پہچان	4/-
تعارف اسلام	4/-
اسلام پندرھویں صدی میں	4/-
راہیں بند نہیں	5/-
ایمانی طاقت	5/-
اتحاد ملت	5/-
سبق آموز واقعات	5/-
زلزلۂ قیامت	7/-
حقیقت کی تلاش	5/-
پیغمبر اسلام	4/-
آخری سفر	5/-
اسلامی دعوت	5/-
خدا اور انسان	5/-
حل یہاں ہے	8/-
سچا راستہ	4/-
دینی تعلیم	5/-

حیاتِ طیبہ	5/-
باغِ جنت	5/-
نارِ جہنم	5/-

الرسالہ کیسٹ

نمبر ۱ ایمان	25/-
نمبر ۲ جدید امکانات	25/-
نمبر ۳ اسلامی اخلاق	25/-
نمبر ۴ اتحاد	25/-
نمبر ۵ تعمیر ملت	25/-
نمبر ۶ سنت رسول	25/-
نمبر ۷ میدان عمل	25/-
نمبر ۸ پیغمبرانہ رہنمائی	25/-
الرسالہ مجلد فی جلد	75/-

God Arises	Rs 60/-
Muhammad The Prophet of Revolution	65/-
Religion and Science	30/-
Tabligh Movement	20/-
The Way to Find God	5/-
The Teachings of Islam	6/-
The Good Life	6/-
The Garden of Paradise	6/-
The Fire of Hell	6/-
Muhammad The Ideal Character	5/-
Man Know Thyself!	5/-

مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳